جلد ۳

چمن امرتسر

بسرپرستی بلیغ الملک علامہ تاجور نجیب آبادی

چیف ایڈیٹر
ڈاکٹر ہنر انوری

ایڈیٹر
چمن لال سیوک

فہرست مضامین

بابت ماہ اپریل ۱۹۳۰ء

تصاویر (۱) کیکئی اور منتھلا (۲) دوشیزہ (۳) یورپ کی شہزادی

شذرات

"چمن" کے عید نمبر کو اہل ملک نے عید کی بشاشت کے ساتھ پسند کیا۔ تین ہزار عید نمبر میں سے دفتر میں صرف فائل کے پرچے باقی رہ گئے۔

اخبارات کے ریویو دیکھ دیکھ کر اب تک اہل شوق عید نمبر کے لئے اصرار آمیز تقاضے کر رہے ہیں۔ ہم اُن کے مطالبوں کا احترام کرتے ہوئے عید نمبر کی فرہمی سے اظہار معذرت کرکے جھکے جاتے ہیں۔ مگر تقاضوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ عید نمبر کے متعلق اخبارات ور سائل کی رایوں کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ "چمن" کا عید نمبر اپنے تمام حریفوں سے بازی لے گیا ہے"۔ بقول مولانا سیّد عابد علی صاحب بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی رکن ادارہ "ادبی دنیا" چمن کا عید نمبر دیکھکر پھر کسی نمبر و مبر کو دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی"۔

ہم خوش ہیں کہ مشاہیر علم و ادب کی ژرف نگاری سے چمن کو اردو ادب کے منتخب رسالوں میں کسی سے کم نہیں سمجھتے۔ "چمن" کے بلند اور دلکش مضامین اور سہ رنگی و یک رنگی تصویروں سے لاہور کے ایک پرانے اور از کار رفتہ تصویری رسالے پر موت کی سی افسردگی طاری ہوگئی۔ ہمارے بڑے بھائی "ادبی دنیا" نے اتنے اُن کے ہوش پراگندہ نہیں کئے۔ جتنی بدحواسی "چمن" کے نمبروں نے اُن پر نازل کر رکھی ہے۔

لاہور کا ایک معاصر جس کا ایڈیٹر غلط پروپیگنڈے کے طلسم بنا بنا کر پبلک کو کئی سال سے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ "چمن" کی آب و تاب۔ "چمن" کی آن بان اور "چمن" کی بے مثل دلکشیوں نے اُس کے فریب و دغل کا طلسم توڑ دیا ہے۔ کرایہ کے مانگے ہوئے بلاک چھاپ چھاپ کر بہت دنوں تک وہ پبلک کو دھوکا دیتا رہا ہے۔ اب اُسے اس غلط اور فریب آمیز تجارت کی اجازت نہیں دی جائیگی اب اُسے اس یقین اور موت کی طرح قطعی مستقبل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کہ اُس کی ردی پنساریوں کی دکانوں پر اپنی کس مپرسی کی نوحہ خوانی کریگی۔

عید نمبر کے بعد سالگرہ نمبر

رسالہ "ادبی دنیا" نے اپنے سالنامہ کی ذمہ داری بھی "چمن" ہی کے سپرد کر دی ہے۔ اس لئے آیندہ سالگرہ نمبر "چمن" اور "ادبی دنیا" دونوں کا سالگرہ نمبر ہوگا۔

یہ کیسا ہوگا۔ خدا پر بھروسا کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے

ہیں۔ کہ "چمن" کا آئندہ سالگرہ نمبر ایسا ہوگا کہ اُن سالچوں کے لئے زندگی کا میدان تنگ کر لے۔ ہوئے اُنکے شکستہ دفتروں ہی کو ان کی دُنیا بنا دیا جائے گا۔ جو اپنے سال بھر کے دس پرچوں کی خواری، بدعنائی، بدحالی اور ابتذال پر اپنے خاص نمبروں کا پردہ ڈال کر پبلک کو گمراہ کر رہے ہیں۔ آؤ ہم ساری اردو دنیا کو چیلنج کرتے ہیں۔ کہ "چمن" کے سالگرہ نمبر کے مقابلے کا جس میں حوصلہ ہو وہ میدان میں اُترے۔ ع

"کھوٹے کھرے کا سکہ کھل جائے گا چلن میں"

چمن کا سالگرہ نمبر بابت سنہ ۱۹۳۱ء

"چمن" کے سالگرہ نمبر میں اہل تماشا کے لئے اتنی حیرتیں جمع کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے جتنی بوالعجبیاں سنہ ۱۹۳۰ء میں اہل بصیرت دیکھ رہے ہیں۔

سالگرہ نمبر کیا ہوگا، کیسا ہوگا، کتنے صفحات کا ہوگا کتنی سہ رنگی اور یکرنگی تصاویر سے مزین ہوگا۔

خدارا یہ تفصیل بالکل نہ پوچھئے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ادبی لائن کے نمائشی اور کرایہ کے پرچوں میں ابھی سے دیمک لگنے لگے۔ اور انہیں وقت سے پہلے وقت اور زمانہ دنیا سے بوریا بستر باندھنے کا فرمان نافذ کردے۔

مختصراً ہم اتنا عرض کئے دیتے ہیں۔ کہ "چمن" کا سالگرہ نمبر ایسا طلعت فشاں اور ضوریز ہوگا کہ دیکھنے والی آنکھیں اُس میں اُلجھ کر رہ جائیں گی۔

ہُنر انوری

دنیائے ادب میں یہ خبر نہایت رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ جناب سری رام صاحب ایم۔ اے دہلوی مصنف خمخانۂ جاوید اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے ہیں۔ آپ نے ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں صرف کی۔ اردو کے ادبی جواہر پارسے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ جن کا تصور بھی انسانی دماغ میں نہیں آ سکتا تھا۔

ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں۔ کہ خدا مرحوم کی آتما کو جنت نصیب کرے۔ اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(ایڈیٹر)

اے خدا

میرا دل دن رات تجھ سے ملنے کے لئے بیقرار رہتا ہے ... اُس طرح جس طرح موت ہر چیز کو برباد کر دیتی ہے مجھے طغیانی کی طرح بہا کر لے جا۔ مجھ سے میری ہر چیز چھین لے۔ میری نیند برباد کر دے۔ میرے خوابوں کو لوٹ لے مجھ سے میری تمام دنیا لے لے۔ اس بربادی میں اس روح میں ہم دونوں کو حسن میں جذب ہو جانے دے۔ آہ یہ کیسی فضول تمنا ہے۔ یہ اُمید محال اے خدا! صرف تیری ہی ذات میں گم ہو کے پوری ہو سکتی ہے۔

(ٹیگور)　　چمن لال سیوک

اخبار اُردو

(ضیاء الملک جناب ملا رموزی صاحب ایم آر اے ایس لنڈن)

ہندوستان پر دو سو برس سے قابض قوم انگریز کا مذہبی اور قومی سال عیسوی ماہِ دسمبر پر ختم ہوتا ہے اور ماہ جنوری سے شروع ہوتا ہے۔اس لئے آخر دسمبر سے شروع جنوری تک انگریزی قوم دل کھول کر خوشیاں مناتی ہے۔اور اسی سلسلہ سے اُس کے کاروباری محکمات میں تعطیل رہتی ہے۔ تو ماتحت اور ملازم ہندوستانی بھی ان تعطیلوں کو "غنیمت جان کر" اپنے بعض نہایت ضروری اور اجتماعی کاموں کی تکمیل و تحصیل میں مصروف ہو جاتے ہیں چنانچہ انہی ایام میں ہندوستان کی سب سے ذی اثر "مجلس وطنی کبیرہ" عرف آل انڈیا نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس بھی ہُوا کرتا ہے۔ اور چونکہ اس مجلس کو تمام ہندوستانی باشندوں کا نمائندہ ہونے کا دعوےٰ ہے اس لئے اس کا یہ اجلاس ہر ہندوستانی کے لئے نہ خاص اہمیت ہی نہیں رکھتا بلکہ وہ ۳۲ کروڑ باشندگان ہند کے لئے قابلِ احترام اور اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ یہ اجلاس شمالی ہند کے دارالحکومت لاہور میں منعقد ہُوا تھا۔ اور یہی وہ تاریخی اجلاس کہا جاتا ہے جس میں "مجلس وطنی کبیرہ" نے اپنا مقصدِ عمل ہندوستانیوں کے لئے "حصول آزادی کامل" قرار دیدیا

اس مجلس کو عموماً "ہندوستان کی قومی پارلیمنٹ" کہا جاتا ہے۔ اور اس کے اعمال و اثرات کو غیر معمولی وقعت دی جاتی ہے۔ اس لئے اس مجلس میں زبان اُردو کے لئے جو کچھ کہا گیا اور جو کچھ کیا گیا وہ ہر اُس ہندوستانی کی مسرّت کا باعث ہوگا۔ جو زبان اُردو کو ہندوستان کی واحد قومی اور ملکی زبان مانتا ہے۔ اور "مجلس وطنیہ" کے ان اعمال کے ہوتے ہوئے اُن حضرات کو اب میدان چھوڑ دینا چاہیئے۔ جو ہندی زبان کو ہندوستان کی واحد زبان کے لئے سر مارتے پھرتے ہیں۔ اور جو اسی لاہوری اجلاس میں چاہتے تھے۔ کہ کسی طرح ہندی زبان اُردو زبان کی سی مقبولیت اور اہمیّت حاصل کرلے۔ مگر خود اس کے حامیوں نے اُردو کی وسعت، صلاحیت اور زندگی کا جو اعتراف کیا اُس کی تفصیل خود اس مجلس کے صدر کی زبانی سُن لیجیے۔ جو لاہور میں عین اسی موقع پر منعقد ہوئی تھی۔ اور جس کا ہندوانی نام تھا "آل انڈیا راشٹریہ بھاشا کانفرنس" اس کے

صدر ایک بالکل ہی "غیر ادبی اور غیر علمی" بزرگ جناب ولبھ بھائی پٹیل تھے جو علاقہ باردولی میں عدم ادائے محصول کی تحریک کے خالص سیاسی رہنما بن کر چند دن سے سیاسی افراد کار میں شمار ہو رہے ہیں۔ حالانکہ اصولاً ایک لسانی اور ادبی مجلس کا صدر کسی مسلم الثبوت ادیب ہی کو ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس پر بھی ولبھ بھائی پٹیل کی نکتہ رس نگاہ نے زبان اُردو کے حق میں جو کچھ کہا وہ یا تو ولبھ بھائی پٹیل کی حقیقت آگاہی تھی یا خود زبانِ اُردو کی اہمیت۔

چنانچہ اس خاص موقع پر لاہور کے مشہور روزانہ اخبار "ملاپ" نے ۲۸۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو اپنا جو خاص ضمیمہ شائع کیا۔ اُس کے صفحہ ۱ کالم ۲ سطر ۴ پر پٹیل صاحب کے خطبۂ صدارت میں یہ الفاظ موجود ہیں:۔

> "آپ نے کہا کہ ہماری زبان ہندی ہونا چاہئے اردو بھی ہندی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہاں اُردو اور ہندی کے جھگڑے رہتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اردو اور ہندی دونوں ایک ہیں۔"

یہ جملے تو ہیں ہندی زبان کی مجلس کے صدر اعلیٰ کے۔ مگر اسی مجلس کے منتظم عرف استقبالیہ مجلس کے صدر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے ہندی زبان کی ترقی کے لئے جو کچھ فرمایا اُس کے بعد "مجلس اعلیٰ وطنی کبیر" کے صدر اعلیٰ کا وہ سلوک بھی ملاحظہ فرمائیے گا جو ممدوح نے زبان اُردو سے کیا۔ نتیجہ یہ کہ بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ چنانچہ آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے کے لئے جو کچھ فرمایا اُس کی اُردو یہ تھی۔ کہ:۔

> "آزادی کے لئے پہلی چیز ہماری قومی زبان ہے۔ انگریزی زبان بدیشی زبان ہے اسے آل انڈیا نیشنل کانگرس سے باہر نکال پھینکنا چاہئے۔"

اب اس کوشش کے باوصف یہ دیکھئے کہ ہندوستان کے ۳۳ کروڑ باشندوں کی نمایندہ مجلس آل انڈیا نیشنل کانگرس نے اپنے خطبۂ صدارت جیسے عظیم الاثر اور وقیع خطاب میں کس زبان کو استعمال کیا؟ اور اس موقع پر حاضرین نے کس زبان کے استعمال کا متفقہ مطالبہ کیا؟ چنانچہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کے اخبار "ملاپ" لاہور کے صفحہ ۶ سے ذیل کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

> "جس وقت ڈاکٹر کچلو صدر استقبالیہ کمیٹی آل انڈیا نیشنل کانگریس چبوترہ پر اپنا خطبہ صدارت انگریزی زبان میں پڑھنے آئے تو جلسہ سے بے شمار آوازیں آئیں۔ کہ خطبہ اُردو میں پڑھئے۔"

اس کے بعد مجلس وطنی کبیر کے صدر اعلیٰ جنہیں عرفِ اصطلاح

میں ہندوستان کے بے تاج بادشاہ بھی کہا جاتا ہے خطبۂ صدارت پڑھنے کھڑے ہوئے تو مجمع نے پھر زبان اُردو کا مطالبہ کیا۔ اس پر صدر اعلیٰ جناب پنڈت جواہر لال نہرو نے زبان اُردو میں خطبۂ صدارت جس طرح پڑھا اُس کے لئے بھی اخبار ملاپ لاہور مورخہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۶ کالم ا کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔ جو لفظ لفظ یہ ہے۔ کہ :-

"پنڈت جی تالیوں اور مسلسل نعروں کے شور کے درمیان چبوترہ پر تشریف لائے آپ نے حاضرین کی آواز سے متاثر ہو کر خطبۂ صدارت اُردو میں پڑھا۔ آپ خطبہ کی طرف بہت کم دیکھتے تھے۔ اور نہایت فصیح اُردو بولتے جاتے تھے"

لیجے آج جبکہ کل ہندوستان کی اس سب سے بڑی نمایندہ مجلس کے صدر اور اس کے چھوٹے صدر یعنی مجلس استقبالیہ کے صدر کو اُردو زبان ہی اختیار کرنا پڑی تو اب اُن بھائیوں کو بھی آج سے اُردو زبان ہی کو اپنی ملکی اور قومی زبان قرار دے لینا چاہئیے جو کل تک اس کے خلاف ہندی زبان کا یادن کا لٹھ لئے پھرتے تھے۔

یہ تو وہ بالکل اصولی کارروائی تھی۔ جو ہندوستان کی اس سب سے بڑی مجلس میں اُردو کے حق میں کی گئی لیکن اس کے بعد اسی قومی اجتماع کے دوسرے جلسوں میں مشاہیر ہند نے زبان اُردو کو جن جن مواقع پر اختیار کیا۔ اُس کا خلاصہ یوں ہے۔ کہ

۳۰ دسمبر کو جبکہ کل ہندوستان کے طلبہ کی نمایندہ مجلس کے اجلاس میں صدر مجلس اعلیٰ وطنی پنڈت جواہر لال نہرو تقریر فرما رہے تھے۔ تو چند غلامی کی ذہنیت رکھنے والے اور اپنے ماں باپ کی زبان سے نفرت کرنے والے لونڈوں نے آپ سے کہا کہ آپ انگریزی زبان میں تقریر فرمائیں۔ تو اس کے جواب میں پنڈت جی نے جو کچھ کہا اُس میں آپ کا "اردو پن" ملاحظہ ہو۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۳۰ء کے اخبار ملاپ لاہور کے صفحہ ۳ کالم ۴ پر پنڈت جی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ کہ :-

"میں بہتر سمجھتا ہوں۔ کہ انگریزی زبان کے عوض میں تامل زبان میں بولوں۔ خواہ اُسے کوئی ایک شخص بھی نہ سمجھے۔ آپکو معلوم ہونا چاہئیے۔ کہ جب جنرل بوتھ شاہ انگلستان سے ملا تھا۔ تو اُس نے اپنی مادری زبان میں گفتگو کی تھی۔ حالانکہ وہ انگریزی زبان جانتا تھا۔ اسی طرح ملک آئرلینڈ کے نمائندوں نے ایک بین الاقوامی مجلس میں اپنی ملکی زبان استعمال کی تھی۔ اس لئے میں بھی زبان اُردو ہی پسند کرتا ہوں۔ اگرچہ میں انگریزی بولنے پر قدرت رکھتا ہوں"

جناب سوباش چندربوس ایک بنگالی نسل کے ممتاز سیاسی رہنما ہیں۔ اور آپ کی مادری زبان خالص بنگالی ہے مگر زبان اُردو کی اس شیرینی، اس ہمہ گیری، اور اس اہمیت کو کس کس طرح جھٹلائے گا۔ کہ آپ نے بھی اس زبان ہی کو ہندوستان کی واحد قومی اور ملکی زبان تسلیم فرماکر اسے حاصل کیا۔ اور قومی مجالس میں اسی زبان کو خطاب و کلام کا ذریعہ بنایا چنانچہ اخبار "زمیندار" لاہور مورخہ ۸۔ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۲ کالم ۱ پر لکھا ہے۔ کہ:۔

"۳۔ جنوری کو لوکو کیرج شاپ لاہور کے مزدوروں اور کارکنوں کے جلسہ میں صدارت کی تقریر کرنے سے پہلے بابو سوباش چندربوس نے کہا۔ کہ:۔

پیارے بھائیو! میں ٹوٹی پھوٹی اُردو میں تقریر کروں گا۔ یہ فرماکر آپ نے ایک طول و طویل تقریر فرمائی"

صوبجات متحدہ کے نامور اور شہرہ آفاق اخبار مدینہ بجنور نے اس اہم قومی اجتماع کے چشم دید حالات کے لئے اپنا ایک فاضل نامہ نگار لاہور میں مقرر کیا تھا۔ چنانچہ مدینہ مورخہ ۲۸۔ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۴ کالم ۱ پر فاضل نامہ نگار نے اپنی جو رپورٹ شائع کی ہے اُس میں ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما جناب گاندھی کے لئے یہ الفاظ موجود ہیں۔ کہ:۔

"گاندھی جی نے بھی تقریر کی۔ اور ان کی تقریر میں ہمیشہ کی طرح متانت موجود تھی۔ وہ اپنی سادہ اُردو زبان میں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے"

اب تو سمجھ لیا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے ہندو رہنما جناب گاندھی نے بھی اس اہم اجلاس و اجتماع میں زبان اُردو ہی کو خطاب کا ذریعہ بنایا؟ تو پھر "دب مرنا چاہئے ڈگی کے تالاب" میں آن علی گڑھ ھزاردوں کو۔ جو رات دن انگریزی زبان میں کائیں کائیں کرتے پھرتے ہیں۔

پس مجلس اعلیٰ وطنی یعنی آل انڈیا نیشنل کانگریس کے مقتدر اور ہندوستان کے سب سے بڑے رہبروں اور مدبروں کے اس طرز عمل سے ثابت ہو چکا کہ سارے ہندوستان میں صرف زبان اُردو ہی اس قابل ہے۔ کہ اسے ہندوستان کی واحد قومی اور ملکی زبان بنایا جائے! اس لئے امید ہے کہ وہ چند ہندو بھائی جو خواہ مخواہ اُردو کو اپنے حق میں پنجاب کا جنرل ڈائر سمجھ بیٹھے ہیں۔ آج سے اس کی ترقی، اشاعت، اور حفاظت میں سرگرم حصہ لیں گے۔ کہ واقعی زبان اُردو صرف مسلمانوں ہی کی جائداد نہیں۔

الحمدللہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو بھائیوں میں ایک ایسا بلند خیال طبقہ بھی موجود ہے۔ جو زبان اُردو کی حمایت۔ حفاظت اور اشاعت میں بڑی سے بڑی داڑھی والے مسلمانوں سے پیچھے نہیں۔ چنانچہ عین اُسی وقت جبکہ لاہور

میں "قومی ہفتہ" منایا جارہا تھا۔ اور ہندوستان کے ہر خیال
اور ہر مقصد کے لوگوں کی انجمنوں کے اجلاس ہو رہے تھے
روشن خیال ہندو بھائیوں کے نامور اخبار "پارس" لاہور
نے اپنی اشاعت مورخہ ۳۱۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۹ کالم ۲و۳
پر زبان اُردو سے ہندوستانی ارباب کار کی بے اعتنائی کا
مرثیہ یوں لکھا تھا۔ کہ :۔

"آج کل لاہور میں ملک بھر کی سیاسی۔ علمی۔
اقتصادی۔ صنعتی اور معاشرتی سرگرمیوں کا
مرکز بن رہا ہے۔ افسوس ہے کہ کسی کو بیچاری
"اردو کانفرنس" کا خیال نہ آیا۔ لاہور کے شعرا
اگر توجہ کرتے تو یہ کام بھی چنداں مشکل نہ تھا"

آگے چل کر اس اخبار نے اُردو کی حمایت کے لئے پنجاب کے
صرف شعراء ہی کی خبر لی ہے اس لئے ہمیں اس موقع پر یہ عرض
کرنا ہے کہ شعراء کو "لسانیات" کا ٹھیکہ دار سمجھ لینا وہ پرانی
اور فرسودہ ذہنیت ہے جبکہ صرف شاعر ہو ادب و زبان کا موجد
مخترع۔ مصلح اور مبلغ مانا جاتا تھا۔

پس زمانے یا علوم نے اگر حضرت داغ دہلوی رحمۃ اللہ
علیہ کے بعد کچھ بھی ترقی کی ہے۔ تو زبان کی ترقی کے بارے میں
اب صرف شعراء ہی کو کوتوال صاحب نہ سمجھ لینا چاہئیے۔ بلکہ
ارباب نثر کو بھی ادب و زبان کے لئے ایک بیحد کارآمد اور مفید
ترچیز سمجھئیے جبکہ یہ بالکل مسلم ہے۔ کہ اگر ارباب نثر نہ ہوں۔ تو
دنیا کی ایک زبان بھی مجلسی حدود سے آگے قدم نہیں نکال
سکتی۔ یہ صرف نثر لکھنے والوں کی کثرت ہے۔ جو آج زبان
اُردو ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک جا پہونچی
ہے۔ شاعروں نے تو صرف یہ کیا کہ ہمیشہ لکھنؤ۔ دہلی اور حیدرآباد
کی محدود گلیوں میں دنگل لڑتے رہے۔ مگر نثر لکھنے والوں نے
اخبارات اور رسالوں کے ذریعہ زبان اُردو کو نہ فقط ہندوستان
بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں پہونچا دیا۔ مصنفین اور مترجمین کی خدمات
بھی ہرگز بھول کے قابل نہیں۔ لہٰذا یہ قاعدہ وضع ہونا چاہئے۔
کہ زبان کے معاملہ میں ارباب نثر و تصنیف کا مرتبہ ان سال
میں دو چار مرتبہ مطلع عرض کرنے والوں سے اونچا سمجھا جائے۔

پھر اگر آپ "انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد" اور "دارالمصنفین
اعظم گڑھ" کو زبان اُردو کی ترقی کا مرکز و مصدر سمجھتے ہیں۔ تو کیا
آپ ثابت کرینگے کہ ان مجالس کے ارکان نے اشعار اور
غزلوں کے دیوان شائع کئے ہیں . . . .
. . . . یا نثر میں بے شمار اور
قیمتی کتابیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ زبان کے معاملہ میں شعراء
کو خواہ مخواہ کا رئیس اعظم سمجھا جائے جن میں کے ۹۵ فی
صدی خود صحیح زبان اور اصول زبان سے ناآشنا ہوتے ہیں

اب دیکھنا ان فقروں پر شعراء کی باسی کڑھی کا بھی
پھسا اُبال؟

ملکت عالیہ اسلامیہ حیدرآباد دکن نے قدر قدرت
اعلیٰحضرت سر میر عثمان علی خان بہادر تاجدار حیدرآباد کے
عہد معارف مہد میں زبان اُردو کی جو گراں منزلت خدمات

انجام دی ہیں۔ اُس پر حامیانِ ادب والسنہ ممدوح گرامی جاہ
کا جس درجہ بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔ چنانچہ یہ دکھانے کیلئے
کہ زبان وادب کی ترقی کا اصل باعث شاعر نہیں۔ بلکہ نثر
نگار ہُوا کرتے ہیں ہم اخبار۔ انقلاب لاہور مورخہ ۲۸ دسمبر
سنہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ ۲ سے ذیل کا اعلان نقل کرتے ہیں۔ اور
اسی سے مملکت عالیہ اسلامیہ حیدرآباد کی ادبی خدمات
کا لائق احترام ثبوت بھی نمایاں ہوگا۔ چنانچہ اصل اعلان
کی عبارت یہ ہے کہ:۔

"خدا کا شکر ہے کہ بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد کے قیام کو اب دس سال ہو چکے ہیں
اس لئے قرار پایا ہے۔ کہ اس کی دسویں سالگرہ
بماہ مہر سنہ ۱۳۲۹ فصلی بابت اگست سنہ ۱۹۳۰ء
میں منائی جائے۔ چنانچہ بزم کی مجلس کابینہ
نے طے کیا ہے کہ اس تقریب میں جملہ جامعات
ہند کے طلبہ سے اُردو زبان میں ایک مضمون
لکھوایا جائے جس کا موضوع سنہ ۱۸۵۷ء کی
تاریخ ہند میں اہمیت ہو"

اس موقع پر اگر علی گڑھ والے ہوتے تو اس مضمون کو انگریزی
زبان میں لکھواتے کہ اُنہیں اُردو کے مقابل انگریزی
بہت محبوب ہے۔ یقین نہ ہو تو علی گڑھ کے ہر عمل میں
انگریزی زبان کا وجود جا کر دیکھ لو۔

ہاں تو آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اس موقع پر بزم تاریخ
نے بجائے مضمون کے کوئی "نظم" کیوں نہ لکھوائی؟

اچھا اب اگر شعرا ہی کو ادب و زبان کی ترقی کا "واحد
آرگن" یا واحد ٹھیکہ دار سمجھا جاتا ہے۔ تو ان حضرات کی خدمات
کا اندازہ ذیل کے تازہ واقعہ سے کیجئے۔ یعنی یادش بخیر
حضرت سیماب اکبرآبادی وہ سیماب اکبرآبادی جن کے
شاگرد یا خود وہ اُنہیں "علامہ" اور "شاعر اعظم" لکھتے ہیں۔
اور یہی وہ دو عدد خطابات ہیں جنہیں سیماب صاحب
کے نام کے ساتھ جب دوسرے اخبارات لکھتے ہیں تو
یہ سیماب صاحب کے حق میں "پھبتی" اور "طنز" کا کام
دیتے ہیں۔ چنانچہ یہی شاعر اعظم صاحب چند دن سے ایک
اخبار نکال رہے ہیں۔ جس کے نام کا خالص اردو زبان
میں اگر ترجمہ کیا جائے تو "ٹوپی" ہوتا ہے۔ چنانچہ اخبار
"ٹوپی" کی اشاعت مورخہ ۲۸۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کے صفحہ
پر حضرت سیماب کی۔۔۔ نظم یا شاعری کی صحت اور
بلندی ملاحظہ ہو جسے ادب اُردو کی ترقی کا باعث سمجھا
جاتا ہے۔ ارشاد عالی ہے۔ کہ ؂

اے صدرِ وطن۔ راہِ وطن کے ہادی
ہے آپ سے امیدِ کرم ایجادی

اب دنیا جہاں کے صرفی نحوی اور لغت والوں کو جمع
کر کے یہاں لفظ "ایجادی" کے معنی صحیح ثابت کرا دیجے تو
ہم مان لیں کہ زبانوں کی ترقی کا باعث صرف شعرا ہوتے
ہیں۔ پھر بھی شاعر اعظم صاحب صفحہ ۳ پر ایک جملہ لکھتے ہیں
کہ "ٹوپی اخبار کا حلقہ اثر متمول اور جاندار طبقہ تک وسیع
ہے" تو اس فقرہ سے ہُوا نا ثابت کہ بعض اخباروں کا

حلقہ اثر غیر جانداروں یا غیر ذی روح اشیاء تک بھی وسیع ہوا کرتا ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔ پھر فرماتے ہیں اور کسقدر بھونڈے پن سے فرماتے ہیں کہ "ڈپٹی کے فی صدی ۸۵ خریدار رئیس۔ فرماں روا اور صاحب حیثیت دارانِ حکومت ہیں"

خدا کے لئے کوئی ایک صرف و نحو کا طالب علم ہمیں اس جملہ کی صحت سمجھا دے کہ "صاحب حیثیت دارانِ حکومت" کیا بلا ہے؟ پھر لکھتے ہیں اور بہت بڑی "بلغ العلیٰ بیت" کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "جن کے اثرات سے ہندوستان ابھی تک مائوف و مؤثر ہے"

کہ اخبارات و رسائل کے ذریعہ نثر میں تبادلۂ خیال کو وسعت حاصل ہے یا نظم کو؟ اور جو ہر حال میں اسی پر اصرار ہوگا تو ہم آیندہ اشاعت میں انشاء اللہ اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت سیماب اور لاہور کے ایک ایسے سیماب خوردہ رسالے کی اُردو اور اُس کی اغلاط کو پیش کرینگے جس کے ایڈیٹر صاحب اپنے سالنامہ کی تعریف خود ہی یوں لکھتے ہیں گویا وہ رسائل اردو میں بس بے نظیر و بے مثال ہے۔ مگر خدا جانے یہ سیماب صاحب سے شاگردی یا عقیدت کی کونسی "نائی کی منڈیانہ تاثیر" ہے۔ کہ شاگرد ہو یا عقیدت مند اُردو جب لکھتا ہے سو غلط۔

لیجئے اب تو اس موقع پر لفظ "مؤثر" سے علامہ شاعر اعظم اور ادیب عالی میاں سیماب کی ساری قابلیت معلوم ہوگئی۔ اب سارے سیماب پسندوں کو اپنے علامہ کی اس بے علمی پر رونا چاہئے۔ کہ بیچارے سیماب صاحب لفظ "مؤثر" اور "متاثر" کے معنی میں کوئی فرق ہی نہیں جانتے۔ اس پر ہیں کہ بیچارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں "اردو ریڈر" یا یوں کہئے کہ "اُستادِ اُردو" کے عہدے کے لئے درخواست دیتے سنے جاتے ہیں۔

اسی لئے ہماری رائے ہے کہ صرف شاعری یا مشاعرہ کو زبان اردو کی ترقی کا سبب قرار دیدینا ہندوستانی عقلمندی تو نہیں۔ یورپ کی ہو تو ہو ورنہ ظاہر ہے کہ اُردو بلکہ ہر زبان کی ترقی کا پہلا سبب نثر ہے۔ اور یہ دیکھتے نہیں

ابھی کہ ہم نے مذکورہ بالا خیالات کو تحریر ہی کیا تھا کہ پنجاب کا نامور روزنامہ "انصاف" لاہور ملا۔ جس نے اپنی اشاعت مورخہ ۹۔ فروری سنہ ۱۹۳۰ء میں حضرت سیماب اور آپ کی اردو کے لئے ذیل کی عبارت لکھی ہے۔ جسے اُن کے عقیدت مندوں کو غور سے پڑھنا چاہئے۔ "انصاف" لکھتا ہے۔ کہ:۔

"عجائب آباد آگرہ میں ایک عجیب شخص رہتا ہے۔ جو ایک ناقابل فہم زبان بولتا ہے اور ہزار زبانوں سے بولتا ہے۔ اس کی ذہانت اور استعداد کا مظہر خاص آگرہ کا "کارخانۂ غزل سازی ہے"۔ یہ "ساغر نکیف اور پیمانہ بدوش شاعر" ہندوستان میں ایک ایسا

لٹریچر پیدا کر رہا ہے۔ جس میں غلط سلط ترکیبوں اور الفاظ کے طلسم کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

آگرہ کے ان شاعر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ شاعری نہ تو مہمل تراکیب لکھنے کا نام ہے نہ درس معصیت دینے کو شاعری کہتے ہیں۔"

اب صاف صاف معلوم کرنے کے لئے کہ یہ شاعرِ آگرہ حضرت سیماب ہی ہیں۔ روزنامۂ انصاف" کے یہ فقرے ملاحظہ ہوں کہ

"آگرہ کے شاعر اعظم نے پچھلے دنوں پورا اخبار نظم میں لکھ ڈالا"

یہ حضرت سیماب ہی ہیں جنہوں نے حال ہی میں اپنے اخبار "ٹوپی" کا منظوم نمبر شائع فرما کر اپنی ذہنی صلاحیت کا دنیا کو ایک مرتبہ پھر مذاق اڑانے کا موقع دیا ہے۔ آخر میں جریدہ انصاف لکھتا ہے۔ کہ:۔

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں شعر و سخن کے متعلق ایک عام بدمذاقی پائی جاتی ہے جسکی ذمہ داری آگرہ کے انہی شاعر صاحب پر عائد ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں بہی خواہانِ اردو کا فرض ہے۔ کہ وہ قلم کو جنبش دیں اور ان مدعیانِ شعر و ادب کی مہمل گوئی کا تار پود بکھیر دیں۔"

ہم جریدہ فریدہ "انصاف" کے فاضل مدیر کو یقین دلانا چاہتے ہیں۔ کہ مجلہ "چمن امرتسر" تو کبھی ایسے غلط اور مہمل لکھنے والوں کے حق میں کمی نہ کرے گا۔ البتہ آپ کو اس سے زیادہ گنجائش حاصل ہے۔ اور جریدہ انصاف کی تائید میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں۔ کہ ملّا رموزی نے ۱۹۲۶ء سے لیکر اس وقت تک جو مسلسل اور خالص علمی اعتراضات حضرت سیماب اور ساغر پر کئے ہیں۔ اُن کا ایک فائدہ یہ دیکھ لیا کہ اب یہ دونوں جب کوئی چند روزہ پرچہ جاری کرتے ہیں۔ تو اس میں بہت احتیاط سے لکھتے ہیں۔ اور مہملات کا ذخیرہ اب ان کی تحریروں سے کم ہوتا جارہا ہے۔ ورنہ یہ تو از سرتا پا مہملات ہی کو مضمون سمجھا کرتے تھے اس لئے اگر چند اہل قلم حضرت اور ان کے پیچھے پڑجائیں تو آپ کا بیان کیا ہوا "مہمل لٹریچر" آج اردو سے کافور ہوا جاتا ہے۔ ورنہ پھر خدا ملّا رموزی صاحب ہی کو زندہ و سلامت رکھے۔ آمین

فاتح قوم کے مسلّمہ اثرات کو غلام اقوام جس طرح قبول کرلیتی ہیں۔ اُس کے ثبوت میں ہندوستانیوں کا اپنی ملکی اور مادری زبان کو چھوڑ کر انگریزی زبان کو اپنی "مادری بنالینا" اب اعتدال کی حد سے گزر چکا ہے۔ اور انگریزی زبان کے اسی استعمال سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ہندوستانیوں کی مجلسی زندگی میں بھی غلامی رچ گئی ہے۔ مگر وہ جو کہا ہے کہ ؎ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

سو بعض صاحب فضل و بصیرت ہندوستانی ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنی مادری زبان، استعمال کرتا دیکھ کر غیر اقوام کے ارباب علم بھی اُس کی عزت اور تعریف کرتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں روزنامہ "انصاف" لاہور مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۳۰ء سے یہ خبر ملی۔ کہ

"اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور کے زیر اہتمام حضرتِ گرامی صوفی غلام مصطفےٰ صاحب ایم۔ اے نے "شاہانِ مغلیہ مصنفین کی حیثیت میں" کے عنوان سے جو ایک عالمانہ تحقیق حاضرین کو سنائی اُس کی زبان اُردو تھی۔"

اب بات تو یہ ہے۔ کہ دوسرے "پروفیسر قوم کے لوگ" بھی جب کبھی "لیکچر یانے" پر آئیں۔ تو وہ بھی صوفی صاحب ممدوح کی تقلید میں لیکچر کی زبان اُردو ہی رکھیں۔ کہ اردو کی وسعت اور ترقی کے یہی اصول و ضوابط اور مواقع ہیں یہ آگرہ کے "مرحدار شاعرئے" نہیں۔

ہم نے بارہا لکھا کہ زبان کے رواج اور فروغ کا اولیں ذریعہ ملک کی درس گاہیں اور خصوصیّت سے ہائی اسکول اور کالج ہیں۔ اگر بہی خواہانِ اردو کو اس کی حفاظت اور ترقی کا کوئی درد ہے۔ تو وہ بہت جلد اور کسی با اثر حیثیت سے ہندوستانی درس گاہوں میں جا کر اُردو کی خبر لیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ اس اصولی خدمت کی طرف توادنیٰ توجہ نہیں۔ صرف "طوائف قسم کی تصویر" اور.... قسم کی عبارت کے رسالے جاری کر دینے کو ادب اردو اور زبان اردو کی وہ خدمت قرار دیا جاتا ہے جو نہ میر انیس مرحوم انجام دے سکے نہ اورنگ آباد کے یہ ضعیف العمر سے مولوی عبدالحق صاحب نتیجہ یہ کہ مخالفین اردو ہیں کہ آئے دن درس گاہوں سے بیچاری زبان اُردو کو کان پکڑ کر نکال رہے ہیں۔ اور وہ ہے کہ اپنے حامیوں کا منہ دیکھ کر رہ جاتی ہے۔

چنانچہ ایسا ہی کچھ برتاؤ صوبجات متحدہ کی درس گاہوں میں ہو رہا ہے۔ اور یہ لکھنؤ کے "تمام خواجہ عبدالرؤف عشرت" ہیں کہ بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ مگر نہیں اُٹھتے۔ تو اُردو کی عملی حفاظت پر۔ اس لئے شہر بجنور کی غریب "انجمن اصلاح مسلم مدرسین" سے اور کچھ نہ بن آیا تو اُس نے ایک مراسلہ اخبار "مدینہ" بجنور مورخہ ۹۔ جنوری ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۷ کالم ۲ پر یوں چھاپ دیا۔ کہ:۔

"ڈسٹرکٹ بورڈ جس سے ہم اُردو کے مدرسین کا تعلق ہے ہمارے ساتھ جو برتاؤ کر رہا ہے اُسے ہم ہی جانتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان حالات کے لئے احتجاج کے طور پر ایک جلسہ منعقد کیا جائے۔"

ملا رموزی کی طرف سے ان اردو کے مدرسین کیلئے فی الحال یہ امداد کی جاتی ہے کہ وہ اپنے تفصیلی حالات دفتر رسالہ چمن امرتسر کے پتہ پر بھیج دیں۔ پھر دیکھیں کہ مخالفین سے ملا رموزی کسی خاص فدویانہ رنگ میں عرض و معروض

کرتے ہیں؟

اب لطیفہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اُن علاقوں میں تو اُردو کی کس مپرسی کا یہ عالم جو اس زبان کے مصدر اور گہوارہ کہلاتے ہیں۔ لیکن اُردو ہے کہ اپنی قدرتی یا وضعی صلاحیت اور شیرینی کے باعث اُن مقامات میں بڑھی چلی جا رہی ہے جہاں اس کے مقبول ہونے کا سان گمان تک نہیں۔ مثلاً اخبار "زمیندار" لاہور مورخہ ۵۔ فروری سنہ ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۳ کالم ۱ و ۲ پر حضرت قاضی محمد مرتضےٰ صاحب نے اپنے ایک مراسلہ میں صوبہ سندھ میں اُردو کی ترقی کے لئے جو کچھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ:۔

"سندھ میں عموماً اور سندھ کے طلبہ میں خصوصاً اُردو کا مذاق پیدا کرنے کے لئے "کراچی اکیڈیمی" کے ارکان نے عملی قدم اٹھایا ہے۔ یعنی اس مقصد کے لئے ایک بڑا جلسہ کیا گیا جس میں "انجمن ترقی اردو" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس خدمت کے لئے حضرات اے۔ ایم آغا۔ مولوی انعام الحق قدوسی منشی فاضل۔ ڈاکٹر صدیقی خواجہ ولایت حسین۔ شیخ عبدالمجید اور سیٹھ فدا علی بانی انجمن قابل ذکر ہیں"

ملا رموزی بھی ان تمام بزرگوں کی خدمت میں بعد سلام مسنون آنکہ ہدیۂ شکر و مبارک باد پیش کرکے عرض کرتے ہیں۔ کہ اگر آپ حضرات نے پوری وحدتِ عمل اور استقلال کے ساتھ سندھ کے علاقوں میں اُردو کو رواج دیا تو مان لیجے کہ قیامت کے قریب جو سب سے بڑی اور سب سے آخری "تاریخ اردو" لکھی جائے گی۔ اُس میں آپ حضرات کے نام یوں درج ہونگے جیسے "تاریخ فتح ترکی" میں مارشل مصطفےٰ کمال پاشا۔ مارشل عصمت پاشا۔ مارشل نورالدین ابراہیم پاشا اور مارشل ملا رموزی کے اسمائے گرامی درج ہیں۔

جنوبی ہندوستان کی طرح مشرقی ہندوستان میں بھی اردو کی ترقی اور اس کی اشاعت کے ذرائع اس درجہ مفقود اور محال ہیں کہ متعدد حامیانِ اردو ان مقامات میں "جامہ نہ دارم درمن از کجا آرم" کہکر بیٹھ رہے۔ مگر قابل احترام و ستائش وہی لوگ تو ہیں جو بے سروسامانی پر بھی "سامانِ صد ہزار" کا حوصلہ لیکر خدمت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ذی حوصلہ حامیانِ اُردو میں اخبار "آواز کلکتہ" کے ارکان بھی ہیں۔ جنہوں نے علاقہ ہائے بنگال و بہار میں زبان اُردو کی اشاعت کے لئے "آواز" نام کا ایک بہترین ہفتہ وار اخبار جاری کیا ہے۔ ارکان اخبار کے خطوط اور خود اس گراں پایہ اخبار کے دو ابتدائی نمبروں کے مطالعہ سے ثابت ہوا کہ اس اخبار کے جاری کرنے والوں کے دل میں اُردو کی ترقی کا جو درد ہے وہ شاید ملا رموزی صاحب کے دل میں بھی نہیں۔ ورنہ وہ بھی نکال دیتے۔ نا اب تک کوئی "حامی اردو اخبار" تو اب

حامیان اردو کی عقل اور سمجھ سے درخواست ہے کہ وہ اخبار آواز کی حمایت میں روپیہ اور تحریر سے جو کچھ مدد فرماسکیں فرمائیں۔ کیونکہ یہی ایک اخبار ایسا نظر آیا ہے جو محض اردو کے نام پر جاری ہوا ہے۔ ورنہ سارے اردو کے اخباروں اور رسالوں کو پڑھکر دیکھ لو کہ ان کا رسم الخط تو صرف اردو ہوگا اور مسائل بیان فرمائیں گے نہرو رپورٹ، گاندھی جی یا غالب و مومن کے فرسودہ مقابلوں کے۔

لیجئے بڑی خوش خبری یہ ہے کہ وہ جو اپنے خواجہ حسن نظامی دہلوی ہیں انہوں نے حال ہی میں ملک برما کا سفر فرمایا تھا اس لئے آپ نے ۲۶۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو قوالی کی سماعت سے پہلے برما میں برمی زبان اور اردو زبان پر یہ لکھ ہی دیا کہ برمی مسلمانوں میں برمی زبان کی حمایت اور ہندی مسلمانوں میں اردو کی حمایت کا بڑا چرچا ہے لیکن اخبار "منادی" دہلی مورخہ ۱۷۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں کل برما کی مسلمان مجلس تعلیم کے سالانہ جلسہ کا جو استقبالیہ خطبہ صدارت شائع ہوا ہے۔ اس میں صاحب صدر نے اردو کی اشاعت اور ترقی کو برمی مسلمانوں پر اسلئے فرض ثابت کردیا کہ ابھی برمی زبان میں مسلمانوں کا مذہبی ذخیرہ مکمل اور مستقل نہیں ہوا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ برما میں زبان اردو کو ترقی دی جائے۔

تو دیکھا آپ نے اردو کے حامی ہر حال میں غالب ہی رہتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ علمی حامی ہوں بقدر غزل اور مشاعرہ نہ ہوں

(ملا رموزی)

غزل

(جناب صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب عاشق ٹونکی)

عدو پر مبتلا تم ہو کہ میں ہوں؟
کہو تو بے وفا تم ہو کہ میں ہوں؟

زمانہ مر گیا تم پر کہ مجھ پر؟
حسین و خوش ادا تم ہو کہ میں ہوں؟

نہیں منتے تو پھر شکوہ نہ کرنا
یہ اب مجھ سے خفا تم ہو کہ میں ہوں؟

بُرا کہنے پہ آن کے لڑ رہے ہو
رقیبوں پر فدا تم ہو کہ میں ہوں؟

کیا فتنہ بپا تم نے کہ میں نے؟
نمونہ حشر کا تم ہو کہ میں ہوں؟

کہا تو بے وفا ہے پھر تو کہنا!
یہ تم نے کیا کہا تم ہو کہ میں ہوں؟

کہا تم نے کہ عاشق بے وفا ہے
ذرا سوچو بھلا تم ہو کہ میں ہوں؟

(غیر مطبوعہ)

مستی کا ترانہ

(انڈین شیکسپیئر جناب آغا حشر کاشمیری)

جائینگے وہاں خوش دلِ دیوانہ جہاں ہو
گھر لیں گے وہیں اب کہ پریخانہ جہاں ہو

مُنہ چوم نہ لے پھول کے دہوکے میں تمہارا
جانا نہ وہاں بُلبل دیوانہ جہاں ہو

ہوگی کوئی جنّت مری جنّت تو وہی ہے
خس خانہ و پیمانہ وجانانہ جہاں ہو

اے حشر مرے شعر میں مستی کا ترانہ
پڑھنا یہ غزل محفلِ رندانہ جہاں ہو

(غیر مطبوعہ) (مرسلہ بابو راجیشور ناتھ ورما)

لالہ زار

(جناب مولانا مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

یہ بارگاہِ عشق ہے، بزمِ عزا نہیں
مستانہ آ ہجومِ تمنا لئے ہوئے

کچھ اور کر بلند ذرا ذوقِ عاشقی
غم بھی ہو اک نشاط کی دُنیا لئے ہوئے

وہ لالہ زارِ طور وہ نزہت گہِ جمال
سب کچھ ہے ایک داغِ تمنا لئے ہوئے

(غیر مطبوعہ) (مرزا احسان احمد)

حدودِ علم الانسان

(جناب مولانا عابد مسیح حسن صاحب عنایتی ایم اے جرنلسٹ مراد آبادی)

علم الانسان عبارت ہے۔کل نسل انسانی کی تاریخ بتمامہ سے جس کو مسئلہ ارتقاء سے انتہائی درجے کا گہرا تعلق ہے۔گویا اس علم کا موضوع انسان بحالتِ ارتقاء ہے۔ علم الانسان حضرتِ انسان کی تاریخ سے بحث کرتا ہے۔ خواہ وہ کسی زمانے یا کسی حصۂ دنیا سے متعلق ہوں۔جسم انسانی پر زمان و مکان کا اثر پڑتا ہے۔نیز وہ ایک عنصر لطیف یعنی روح سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔یہ لطیف عنصر خود بھی اپنے ماحول کے زیر اثر ہے۔پس علم مذکور کی خدمت بنی آدم کے جسمانی اور روحانی ارتقاء کی تاریخ بیان کرنا ہے۔ لیکن چونکہ علم کو تشخصات و ذاتیات سے گذر کر تعمیمات و اصول کے درجہ تک پہنچنا ضرور ہے۔اس وجہ سے علم الانسان کا مقصودِ غائی تعمیم کرتے کرتے ایسے اصولِ عامہ کا دریافت کرنا ہے۔جن کے جان لینے سے ارتقائے انسانی کا راز منکشف ہو سکے۔

علم الانسان ڈارون کے مسئلہ ارتقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔اصولِ ارتقاء کا تسلیم نہ کرنا علم مذکور کے وجود سے انکار کرنا ہے۔ارتقاء کسی مسئلہ محکمہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض ایک ظنیہ ہے۔اس قسم کے ظنیات کا کام یہ ہے کہ جب بعض امور معلومہ میں غور کرنے کے بعد کوئی نتیجہ بطور قانون اخذ کر کے فرض کر لیا جاتا ہے۔کہ یہ نتیجہ ایک حقیقت ہے۔تو دیگر امور متعلقہ کو اس حقیقتِ مفروضہ کی کسوٹی پر کستے ہیں۔پس اگر ایسے امتحانات و تقابلات سے متحقق ہو کہ جتنے امور میں غور کیا ہے۔وہ سب کسی رشتۂ اتحاد میں منسلک ہیں۔اور کسی قسم کی تعقید لازم نہیں آتی تو مان لیا جاتا ہے۔کہ یہ قانونِ مفروض از قسم اصول ہے۔ جس کے زیر عمل بعد تحقیقات دیگر امور بھی پائے جائینگے۔ جو ہنوز اس کسوٹی پر کس کر نہیں دیکھے گئے ہیں۔چونکہ کل امورِ ممکنہ بلکہ کل .... امور ملحقہ کا امتحان کسی ایک وقت میں نہیں ہو سکتا۔اس لئے قسم مذکور کے نتائج دریافت کردہ یا اصول مفروضہ کو صرف ظنیات کہتے ہیں۔جیسا ہمنے اوپر بیان کیا مسئلہ ارتقاء اسی صورت کے ظنیات میں سے ایک ظنیہ ہے۔مسئلہ مذکورہ میں یہ حقیقت فرض کی گئی ہے۔کہ دنیا میں جتنی اقسام کے جاندار ہیں۔اُن سب میں کوئی باہمی رشتہ ہے۔اور ان کل جانداروں کے باہمی تعلقات جو زمان و مکان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ ایک ہی نتیجۂ مترتبہ یا عام قانون کے تحت میں لائے

جا سکتے ہیں۔

اس کے معنے یہ ہوئے کہ ہم میں اور دیگر جانداروں میں بعد المشرقین نہیں ہے۔ یعنی خواہ ہم کتنے ہی ترقی کردہ ہوں مگر ہیں اُنہیں میں سے ایک۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتِ انسان کی شانِ عظمت کی پاسداری میں بہت سے علماء نے بھی شروع میں مسئلہ ارتقا کے پیش کرنے والوں کی بہت مخالفت کی۔ اور ہمارے مشرق میں تو اب تک بیحد مخالفت کی جاتی ہے حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے اپنے ان شعروں میں اہلِ ہند کی عام رائے اس مسئلہ کے متعلق بیان فرمائی ہے ؎

مشرقی کو ہے ذوقِ روحانی — مغربی کو ہے میلِ جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈاروِن بولا بوزنا ہوں میں
سُن کے کہنے لگے میرے اک دوست
فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

گو مغرب میں بھی ہنوز بعض لوگوں کو مسئلہ مذکور پر اعتراض ہے۔ لیکن عموماً ہر طبقہ کے علماء نے کسی نہ کسی صورت میں اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ بعض علمائے معترضین کی کیفیت یہ ہے۔ کہ جب تک نباتات و حیوانات میں ارتقائی عمل محدود سمجھا جائے اُس وقت تک اُنہیں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر جہاں کسی نے بنی آدم کو انہیں اصول عامہ کے تحت میں بیان کیا۔ وہ فوراً ناخوش ہو جاتے ہیں۔

اس تنگ نظری کو دور کرنے کی غرض سے اہل علم الانسان دیگر علماء اور مخالف رائے رکھنے والوں سے کہتے ہیں۔ کہ "جو نتائج ہم نے بعد تحقیقات اخذ کئے ہیں۔ آپ اُن کو از سرِ نو جانچ کر دیکھ لیجئے۔ کہ درحقیقت وہ صحیح ہیں یا غلط۔ نسل انسانی کو چند ہزار سال میں محدود نہ کر دیجئے بلکہ نظر کو وسعت دیجئے اور جدید تحقیقات پر عمیق و منصفانہ نظر ڈالئے۔ تعصب مانع ترقی ہے۔ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ جس صورت میں ڈاروِن نے اس مسئلے کو بیان کیا ہے۔ آپ اسی طرح مان لیں۔ بلکہ صرف یہی کہ اُس نے جس حقیقت سے بحث کی ہے آپ مخلّیٰ بالطبع ہو کر اس میں غور کیجئے........ وغیرہ وغیرہ"

اب تک علم الانسان نے زیادہ تر نسل انسانی کی ابتدائی حالت سے بحث کی ہے۔ سبب اس کا وہی ہے جو اوپر بیان ہُوا۔ جب تک علم مذکور موجودہ انسانِ متمدن کو معرضِ بحث میں نہ لائے۔ اور اپنے آپ کو قدیم زمانے کے "وحشیوں" کی بحث میں محدود رکھے اس وقت تک لوگ تعرض نہیں کرتے۔ اس حد سے تجاوز کیا۔ اور اُدھر احتجاج شروع ہُوا۔ احتیاطاً اس علم کے ماہروں کی طرزِ عمل اب تک ایسی ہی رہی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ کہ موجودہ اقوام متمدنہ علم مذکور کے دائرہ تحقیقات سے خارج ہیں۔ نہیں نفس دعوے میں بال برابر کمی نہیں ہو سکتی۔ دعوے ماہرین کا بلا کم و کاست یہی ہے۔ کہ مثل دیگر جانداروں کے حضرتِ انسان بھی خواہ وہ کسی زمانے کے یا کسی ملک کے باشندے ہوں، ارتقائی کلیات کے زیرِ عمل اور اپنے ماحول کے زیر اثر ہیں۔

(غیر مطبوعہ) — عابد مسیح

وجدانیات

(خواجہ غلام فریدؒ چاچڑ والی کا پُرتاثیر کلام)

جناب مولنا صادق ایوبی صاحب

دنیا کی بہترین شاعری میں اگر ملتانی زبان میں کوئی چیز بے تکلف پیش کی جاسکتی ہے۔ تو وہ خواجہ فریدؒ کا وجد آفریں کلام ہے۔ اس باکمال اور واقفِ اسرارِ فطرت شاعر نے اپنے کلام میں قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ، شُستہ اور صاف زبان میں ایسے دلکش اسلوب سے بیان کیا ہے۔ کہ آدمی پڑھکر سر دُھننے لگتا ہے۔ ذیل میں ناظرینِ "چمن" کی دلچسپی کیلئے آپ کے کلام کا تھوڑا سا ترجمہ پیش کرتا ہوں:۔

خونابہ فشانی سے اپنی پوشش داغدار کرچکی ہوں۔ عالمِ فراق میں سارے شگون بد ہیں۔ سکھیاں! ــــــ بخت اور سہاگ کی مالک ہیں۔ لیکن اس بپت کی ماری کا بخت اور سہاگ مفت میں لُٹ گیا ہے۔ آہ محبت کی یہ گرانباریاں بھی غضب ہیں ــــ!! کوئی سرمہ کشی میں مصروف ہے اور کوئی بن سنور کر تزئینِ جمال میں محو ہے۔ لیکن میرا طور بے طور ہو رہا ہے ــــــ

کسی کے باغِ حسن میں بہار آئی ہے اور وہ جوبن کی ماتی ہو رہی ہیں۔ کوئی سیج پر محوِ استراحت ہے۔ کسی کا بازو اپنے پیا کے لئے سرہانہ کا کام دے رہا ہے۔ لیکن میں ہجراں نصیب مصروفِ آہ وفغاں ہوں ــــــ!

میری ہم سِن زیور سے لدرہی ہیں۔ لیکن میرا بستر آنسوؤں سے تر ہوچکا ہے۔ محبت کی تلخیوں نے مجھے مار ڈالا ہے۔ بکا؛ بیں سے فرصت ہی کہاں؟ ــــــ

پیا کو فرید کی چاہ نہیں۔ اسی سوگ اور غم میں راتیں تڑپ تڑپ کر کاٹتی ہوں۔ اور گریۂ مسلسل سے آنچل اشک آلود ہو رہا ہے ــــــ !!!

میری قسمت میں غم کھانا ہی لکھا ہے۔ خوشی کے سامان اب ایک آنکھ نہیں بھاتے چاندنی راتیں ہیں۔ سکھیاں سیر کو نکلی ہیں لیکن میں برہ کی ماری کلبۂ احزاں میں ہوں! ساون کی رُت ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ سکھیاں مل جُل کر نہا

ہی ہیں۔ سیلن میں پیت کی ماری ارمانوں میں غرق ہوں ——— !!

بدبخت "کھیڑا" میرا دامن چھوڑ دے۔ میں تو روزِ ازل سے "رانجھا" کی ہوں اور وہی میرا سرتاج ہے ———

رانجھا" کی محبت میں آبائی تخت و تاج چھوڑ چکی ہوں۔ اسی لگن میں سکھیاں، سہیلیاں، خویش اور قبیلہ کو بھولکر

سی کی صرف اُسی کی ہو رہی ہوں ——— !!!

سکھیاں ——— اپنے اپنے گھروں میں دادِ عیش دے رہی ہیں۔ لیکن میں خانماں برباد ویرانے میں ہوں اور

آوارۂ قضا ہوں ——— فریدؔ کو بارگاہِ عشق سے یہ خلعت ملا ہے۔ کہ خاک چھان چھان کر اُس کا چہرہ گرد آلود ہو چکا ہے

صادق ایوبی

(غیر مطبوعہ)

گہرہائے تاج

(جناب مولانا ظہیر الدین حسن صاحب تاجؔ زبیری)

یہ انقلاب گردشِ ہفت آسماں کے ہیں
صورت قفس کی۔ تنکے مرے آشیاں کے ہیں

کیونکر کہوں کہ دل کی بر آئے گی، آرزو
ہو پاس وعدہ ان کو وہ ایسے کہاں کے ہیں

دہرایا جائے گا نہ کبھی قصۂ فراق
مانا کہ منتظر وہ مری داستاں کے ہیں

پرسانِ حال موت بھی ہوتی نہیں کبھی
پھوٹے ہوئے نصیب مجھ ناتواں کے ہیں

جنبش میں تنکا تنکا ہے گلشن کا دیکھنا
اے ہم نوا ضرور یہ جھونکے خزاں کے ہیں

محرومِ وصل، مضطرب الحال، نامراد
یہ تین جملے گویا مری داستاں کے ہیں

منزل پہ کیوں نہ پہونچیں گے آوارگانِ عشق
آخر تو ساتھ ساتھ ہی عمرِ رواں کے ہیں

اے برق کوند کوند کے کیوں آج رہ گئی
باقی ابھی تو تنکے مرے آشیاں کے ہیں

ناصح کی بات سُن کے بھلا تاجؔ کیا کروں
سجدے مرے نصیب میں اس آستاں کے ہیں

(غیر مطبوعہ)

لال حویلی کا بھوت

(ایک دلچسپ سُراغرسانی افسانہ)

از جناب ظفر قریشی دہلوی

(۱)

میں نے میز پر جھک کر کیلنڈر دیکھا۔ آٹھ اور نو تاریخ کی چھٹی تھی۔ اور میرا ارادہ تھا کہ اس دن سیر کے لئے قطب جاؤں۔ مگر ابھی تک فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ کہ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ اور میں نے کہا "اندر تشریف لائیے"

کمرہ میں ایک نوجوان داخل ہؤا جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ اور ایک سُرخ کوٹ پہنے ہؤا تھا۔ میں نے بہت تپاک سے خیر مقدم کرتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ جب اس نے رومال نکال کر پسینہ پونچھ لیا تو کہا "میرا نام محمد طفیل ہے۔ اور میں مہرولی (قطب) میں رہتا ہوں جس مکان میں رہتا ہوں اسے لوگ "لال حویلی" کہتے ہیں اور یہ میرے والد کی وفات پر مجھے حال ہی میں وراثتاً ملی ہے۔ لال حویلی ایک بہت پرانی اور کسی قدر بوسیدہ عمارت ہے یہ ہمارے خاندان کا موروثی مکان چلا آتا ہے۔ اور جیسا کہ عموماً پرانے مکانوں کے سلسلہ میں بھوت پریت کی کہانیاں اس سے بھی منسوب کی جاتی ہیں۔ میرے پردادا غدر میں باغی ہو گئے تھے اور جب شہر میں گوروں نے چن چن کر غداروں کو قتل کرنا شروع کیا تو وہ بھی دلّی سے بھاگ کر اپنے خرید کردہ مکان "لال حویلی" میں آ رہے مگر انہیں ایک ہفتہ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ گوروں نے مہرولی میں ان کا پتہ چلا لیا۔ اور ایک فوجی سپاہی نے انہیں گولی سے شہید کر دیا انہیں پائیں باغ میں دفن کر دیا گیا مگر لوگ کہتے ہیں ـــــ اور میں بھی کہتا ہوں کیونکہ چشمدید واقعہ ہے ـــــ کہ ان کا بھوت پھرتا رہتا ہے"

"کیا آپ نے ان کا بھوت دیکھا ہے؟"

"جی ہاں نہ صرف میں نے بلکہ نوکروں نے بھی دیکھا ہے۔ میرے والد کے وقت کا ایک ملازم ہے سوائے اسکے میرے ہاں کوئی نوکر چھ مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔ کیونکہ جسے ایک دفعہ وہ بھوت نظر آ جاتا ہے وہ دوسرے دن اس آسیب زدہ "لال حویلی" میں ٹھہرنا گوارا نہیں کرتا"

"اس نوکر کا کیا نام ہے؟"

"تقی"

"کیا اس نے بھی بھوت دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے۔ مگر ہم جس قدر خوفزدہ ہیں وہ اتنا نہیں ہے"۔

"مگر آپ اس مکان میں کیوں رہتے ہیں، چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

"ہمارے ہاں وراثت کی یہ شرط ہے کہ وارث کسی صورت میں اس مکان کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اور اگر چھوڑ کر جائے گا۔ تو والد مرحوم کی وصیت کے مطابق یہ مکان تقی کی ملکیت ہوجائے گا۔ میں اسی وجہ سے مکان نہیں چھوڑتا کہ اگر خالی کردیا تو تقی مالک بن جائیگا"۔

"بہت عجیب شرط ہے!"

"بیشک! مگر آپ سمجھتے ہیں۔ کہ میرے والد کو اس نوکر سے بہت محبت تھی۔ اس وجہ سے اُنہوں نے اس کے حق میں یہ شرط بھی لکھوادی تھی۔ بہرحال آپ میری مدد کیجئے۔ میں اس بھوت کے ہاتھوں بہت نالاں ہوں۔ لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے ہیں۔ میرا وکیل بھی کہتا ہے۔ تمہیں خفقان ہوگیا ہے۔ بھوت پریت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مگر میں کیسے یقین کروں۔ میری آنکھوں نے بھوت دیکھا ہے"۔

"لیکن میں تو کوئی عامل یا بھوت پریت جھاڑنے والا نہیں ہوں۔ میں تو ایک معمولی پرائیویٹ سراغرساں ہوں"۔

"آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں کسی صورت سے وہاں ایک دن آکر تفتیش و تحقیق کیجئے"۔

میں کل قطب جانے کے لئے سوچ ہی رہا تھا۔ اب ایسا موقع ہاتھ سے نہ کھونا چاہئے۔ سیر بھی ہوجائے گی۔ اور اگر کوئی کیس مل گیا تو آمدنی کا ذریعہ ہوجائے گا۔

"میں کل صبح ۹ بجے لال حویلی پہونچ جاؤں گا۔ آپ مطمئن رہیں"۔

نوجوان اٹھا اور شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

(۲)

لال حویلی بیشک ایک قدیم طرز کی عمارت تھی۔ اور کہیں کہیں سے بوسیدہ لال حویلی میں ایک کمرہ جسے "نگارخانہ" کہتے تھے۔ طفیل صاحب کی دلچسپی کا خاص مرکز تھا۔ اس "نگارخانہ" میں طفیل کے خاندان کے تمام ممبروں کی قد آدم تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ طفیل کا خاندان ہندوستان کے ایک مشہور جنگجو فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسکے خاندان کے افراد نے بہت سے معرکوں اور ہندوستانی تاریخ کے بنانے بگاڑنے میں بہت کچھ حصّہ لیا تھا اس وجہ سے مجھے یہاں پہنچکر بہت کچھ تاریخی مواد ملا۔ بالخصوص تصویریں بہت عمدہ کھنچی ہوئی تھیں۔ اور جابجا قرینے سے آویزاں تھیں اس کمرہ کے بالکل قریب ہی نوکروں کے رہنے کی کوٹھڑیاں تھیں۔ مسٹر طفیل نے سب سے بڑی قد آدم تصویر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہ میرے پردادا نعیم خاں کی شبیہ ہے"۔

ہم باتیں کرتے ہوئے برآمدہ میں آنکلے۔ کہ ایک بوڑھا شخص جس کی عمر کسی صورت سے بھی چالیس پچاس سے کم نہ تھی ہمارے سامنے سے گذرا۔ اور طفیل نے اشارہ

کرتے ہوئے کہا "دیکھئے یہ تقی ہے۔"

میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا اور پوچھا آپ کو بھوت کہاں نظر آتا ہے۔ طفیل نے جواب دیا "یہ بھوت ہمیشہ اس جگہ کالے لباس اور بھیانک شکل میں نظر آتا ہے۔"

(یہ کہکر طفیل نے "نگارخانہ" کے دروازہ کے جو جھوت یعنی ٹیڑھا کونہ پڑتا تھا اشارہ کیا اور کندھا ہلاتے ہوئے کہا) "سوائے تقی کے اور سب لوگوں نے بھوت کو اس ہی کونہ میں کھڑا دانت دکھاتا ہوا دکھائی دیا ہے۔ مگر تقی نے صرف باغ میں پھرتا دیکھا تھا۔"

"آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہاں چھوڑ جائیے میں کچھہ تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت خوب" یہ کہکر طفیل چلا گیا۔ اور میں اپنی تفتیش میں مشغول ہو گیا۔

(۳)

میں تین دن لال حویلی میں رہا لیکن ایک دن بھی بھوت نظر نہ آیا ——— یہ ایک بہت عجیب بات تھی، کہ روز رات کو آنے والا بھوت ایک سراغرساں کی آمد سے ڈر کر اپنے درشن دینے موقوف کردے!

طفیل کے وکیل سے ملاقات کر کے کچھہ حالات دریافت کئے۔ لال حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مگر بھوت کوئی قاتل یا چور ہوتا تو مل جاتا۔ وہ تو ما فوق الفطرت چیز ہوتی ہے۔ بھلا سراغرساں کی کہاں رسائی ہوسکتی ہے۔

تیسرے دن میں نے طفیل سے کہا "آج میں آپکے بھوت کا خاتمہ کردوں گا۔ وہ پھر آپ کو دق نہ کریگا۔"

یہ کہکر میں نے اس کے کان میں کچھ باتیں کیں۔ اور وہاں سے رخصت ہو کر "نگارخانہ" میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ تقی نعیم خاں کی تصویر کو کھڑا گھور رہا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بڑے میاں کیا بھوت کو دیکھ رہے ہو! تم لوگ بھی کمال کرتے ہو! کیا واقعی تمہیں بھوت نظر آتا ہے؟"

"جی ہاں! اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"میں آج شام دہلی جا رہا ہوں۔ تم میرے کمرہ میں جاکر بستر وغیرہ درست کردو لیکن بہت جلد۔"

"بہت اچھا ابھی جاتا ہوں۔"

نوکر نے یہ حکم سنکر اپنا راستہ لیا۔ اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

(۴)

طفیل نے حکم دیدیا تھا۔ کہ آج شام کو وہ کسی ملاقاتی سے نہیں ملیں گے۔ اسلئے مطمئن ہو کر وہ میرے ساتھ کتب خانہ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس اثنا میں میں نے اسے چپکے چپکے سب باتیں سمجھا دیں۔ جب رات کو بارہ بجے تو میں، طفیل اور نگارخانہ کی طرف جانے لگا۔ غریب طفیل پر بھوت کا اتنا اثر تھا کہ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور کہا "میں تو رات کو وہاں نہیں جاسکتا۔ اگر آپ جانا چاہیں تو جائیں۔"

"آئیے کیا ڈر ہے؟" بادل ناخواستہ وہ میرے ساتھ ہولیا

میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے۔ میں نے کمرہ پر پہنچکر آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ جوں ہی دروازہ کھلا ہمیں کوئی سیاہ چیز متحرک نظر آئی۔

طفیل میری پشت کے پیچھے چھپ گیا۔ اس وقت اس کے اوسان باختہ ہو رہے تھے۔ سیاہ چیز ہماری جانب بڑھی۔ ہم ابھی تک چوکھٹ کے قریب کھڑے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کمرہ میں کوئی چیز متحرک تھی۔ مگر کیا تھی مجھے نظر نہ آسکا۔ چاہتا تھا کہ برقی شمع (ٹورچ) روشن کرکے اس پر روشنی ڈالوں۔ مگر دفعتاً کوئی چیز کھٹ سے بولی۔ اور پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

میں نے اندر قدم رکھا اور خوفزدہ طفیل کو گھسیٹتا ہؤا بالآخر نعیم خاں کی ملتی ہوئی تصویر کے سامنے لے آیا۔

چھڑی سے تصویر کے ہلتے ہوئے فریم کو ایک طرف ہٹایا تو دیوار میں ایک لمبا خلا دکھائی دیا!

(۵)

جب میری برقی شمع کی روشنی تاریکی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ تو دیکھا کہ ایک شخص جلد جلد اپنا کالا لباس اتارنے میں مشغول تھا۔ مصنوعی داڑھی مونچھیں علیحدہ کرچکا تھا۔ خلا میں ایک طرف پرانی طرز کے جوتے اور ایک پگڑی بکھری پڑی تھی۔

بدہیبت شکل پر خلا کی گرمی سے پگھل جانے والے رنگ و روغن پسینہ کی مانند بہ نکلے تھے۔ اور تقی کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔

میں نے اسے دیکھکر کہا، یار! تم تو سمجھ رہے ہوگے۔ کہ میں نے تو اسے لاری میں سوار ہوکر دہلی جاتے ہوئے دیکھا تھا یا اس وقت میرے سامنے روح قبض کرنے کیسے آنازل ہؤا۔ مگر فکر نہ کرو میں بھی تمہاری ٹوہ میں لگا ہؤا تھا۔ معلوم نہیں مسٹر طفیل آپ سے کیا سلوک کرینگے آیا پولیس کے حوالے کرینگے یا نہیں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ تم نے بھوت بن کر سب کو نچا رکھا تھا۔ لیکن یہ بھول گئے۔ کہ سیر کو سوا سیر ہر جگہ......"

غرض دو چار طعن آمیز جملے کہے۔ اور خفیف ہوکر اپنے کپڑے سنبھالتا ہؤا اس جگہ سے نکلا۔ اور اپنی کوٹھڑی کی جانب چلدیا۔

(۶)

ہم نے تصویر کا فریم اسی جگہ ٹھیک کیا۔ اور کتب خانہ میں واپس آگئے۔ اور طفیل کو مخاطب کرکے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ بھوت کا سُراغ لگانا کیسا آسان کام تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے آپ کے نوکر کی آواز پر شبہ ہؤا تھا۔ یہ ایکٹروں کی آواز سے مشابہ تھی۔ اس وجہ سے مجھے شبہ ہؤا کہ کہیں یہی حضرت بھیس بدل کر نہ ڈراتے ہوں۔ پس اس شبہ کی تصدیق کرنے کے لئے میں نے اس کی کوٹھڑی میں جاکر تلاش اور جستجو کی۔ چنانچہ میں نے چند خطوط پائے جو تھیٹریکل کمپنیوں سے آئے تھے۔ اس سازباز کے حالات مجھے بخوبی معلوم ہوگئے تو یہ نتیجہ نکالا کہ یہ شخص ضرور کسی زمانہ میں ایکٹر ہوگا۔ اور اسے بھیس بدلنے میں کمال حاصل ہے"

"ایک خط ایسا دستیاب ہوا جس میں ایکٹروں کے سامانِ نقالی فروخت کرنے والی کمپنی سے کچھ سودا خریدنے کا ذکر تھا۔ پس مجھے یقین ہوگیا کہ اس نے کہیں سے سامان بہم پہنچایا ہے۔ اور بھیس بدل کر اب بھوت بنا ہے۔ اور آپ لوگوں کو ڈراتا ہے۔ میں نے نگار خانہ میں پہنچکر اپنی چھڑی سے فرش اور دیواروں کو کھٹ کھٹایا تھا ــــ شاید آپ نے غور کیا ہو ــــ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کہیں خلا ہے یا نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو پندرہ منٹ کے لئے باہر بھیجدیا تھا۔ اس کی وجہ تحقیق تھی۔ چنانچہ مجھے تصویر کے پیچھے ایک کھوکھلی جگہ نظر آگئی۔ تصویر اس قدر بڑی تھی۔ کہ اس تمام خلا کے دروازہ کو بالکل ڈھانپ رکھا تھا۔ خلا میں تلاش کیا تو تقی کے کوٹ کا ایک بٹن پڑا ہوا مل گیا۔ پس مجھے..... معلوم ہوگیا کہ یہاں روزانہ کون "بھوت" آتا تھا۔ جب میں تم سے رخصت ہو کر یہاں آیا تو دیکھا کہ تقی اس تصویر کیطرف گھور رہا تھا۔ حقیقت میں وہ تصویر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ آنکھ بچا کر اس کے پیچھے چھپنا چاہتا تھا کہ اتنے میں مَیں آتا ہوا دکھائی دیا۔ اور وہ جھٹ چپ چاپ کھڑا ہوگیا گویا تصویر دیکھ رہا تھا۔"

"آپ بہت ذہین آدمی ہیں!"

"اس میں ذہانت کیا خاک دھری ہے! یہ تو نہایت معمولی معمولی باتیں ہیں۔ صرف ذرا سے مشاہدہ اور غور کی ضرورت ہے۔ بھلا یہ تو سوچئے کہ سب کو بھوت نگار خانہ کے اس کونہ میں دکھائی دے اور ــــ میاں تقی کو باغ میں!"

"بیشک یہ عجیب بات ہے۔ آخر اس ڈرانے اور بھوت بننے سے تقی کو کیا فائدہ تھا؟"

"واہ! آپ وصیت کی شرط بھول گئے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اگر آپ ڈر کر اس مکان کو چھوڑ دیتے تو آپ کے والد کی وصیت کے مطابق یہ اس مکان کا مالک بن بیٹھتا۔ یہ تمام تفصیلات مجھے آپ کے وکیل سے دستیاب ہوگئی تھیں اور اس نے بھی اپنا شبہ یہی ظاہر کیا تھا۔ کہ بھوت نہیں بلکہ تقی اپنے مفاد کی خاطر چال چل رہا ہے مگر آپ جیسے سادہ لوح اور ڈرپوک آدمی اسے جن یا بھوت ہی سمجھتے رہے جب مجھے محرک معلوم ہوگیا۔ شبہات نے حقیقت کی شکل اختیار کرنی شروع کردی۔ تو بتدریج تمام سراغ لگالیا اور آج آپ کا "بھوت" موجود ہے۔"

(۷)

طفیل نے اپنے "بھوت" کو مکان سے فوراً نکال دیا۔

اور میں اپنی مقررہ فیس لیکر دہلی واپس آگیا۔ واپسی پر میز پر ایک خط پڑا ہوا ملا ــ جس میں کسی ایڈیٹر نے ایک سراغ رسانی افسانہ بھیجنے کی درخواست کی تھی ــــ مجھے اس واقعہ سے زیادہ دلچسپ اور ستم ظریفی...... کی بہتر مثال نہ مل سکی۔ اس وجہ سے اسے قلمبند کرکے اشاعت کے لئے روانہ کردیا ــــ بتائیے کہ آپ نے کچھ کبھی ایسا "بھوت" دیکھا ہے؟"

(غیر مطبوعہ)

ظفر قریشی دہلوی

سارلا

(سارلا کی ٹریجیڈی کا ایک منظر)

جناب مولانا محشر عابدی صاحب

سُرنیدر کا مکان

سین۔ خالی مکان۔

(سارلا مٹی کی ہانڈی لئے ہوئے سامنے کے ایک دروازہ سے داخل ہوتی ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سر اور نگاہیں سامنے اوپر اٹھائے ہوئے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ سامنے کی ٹوٹی ہوئی کرسی سے ٹکر لگتی ہے ہانڈی ٹوٹ کر گر پڑتی ہے۔ اور اس کے اندر کے پکے ہوئے تمام چاول زمین پر بکھر جاتے ہیں)

سارلا۔ (گھبرا کر) اوا للہ۔ یہ کیا ہوا؟

(وہ وہیں زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور سر ہاتھ پر رکھکر کسی گہرے خیال میں چلی جاتی ہے۔ تھوڑی دیر گذر جاتی ہے سرنیدر داخل ہوتا ہے)

سرنیدر۔ سارلا۔ سارلا کیسی اُداس بیٹھی ہو؟

سارلا۔ اُداسی بھاگ میں ملی ہے۔ پران ناتھ۔ میں کیا کروں

سرنیدر۔ کیوں آخر اس سوگ کی وجہ کیا ہے؟

سارلا۔ دیکھو یہی سامنے پڑی ہوئی ہانڈی۔

سرنیدر۔ افسوس یہ کیسے ٹوٹ گئی؟ سارے چاول مٹی میں مل گئے۔

سارلا۔ مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ نیستی میں آٹا گیلا ہوتا ہے۔ میں معلوم نہیں کیا سوچتی آرہی تھی۔ اور ہانڈی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے نیچے نہ دیکھا۔ کرسی سے ٹکر لگ کر ہانڈی ٹوٹ گئی۔

سرنیدر۔ کیا چاول اتنے ہی تھے۔

سارلا۔ ہاں سب ختم ہوگئے۔ کیا تم کو کوئی ملازمت نہیں ملی۔

سرنیدر۔ نہیں ابھی تک تو کہیں نہیں ملی۔ اور نہ یہاں ملنے کی کوئی امید ہی نظر آتی ہے۔

سارلا۔ (تھوڑی دیر کے بعد) دو چار پیسے بھی نہیں کہ اور منگالوں

سرنیدر۔ دو چار پیسے کیا۔ ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے جتنے روپے تھے سب ریس میں ہار گیا۔

سارلا۔ پھر اب کیسے کام چلے گا۔

سرنیدر۔ ان چاولوں کو اٹھا کر دھو دو۔

سارلا۔ گرد میں لت پت ہیں۔ کھائے نہ جائیں گے۔

سرنیدر۔ (انتہائی مایوسی سے) کیسے بھی ہوں نگل لینگے۔ اور اس

وقت پھر ہو ہی کیا سکتا ہے؟

(ہرلش چندر داخل ہوتا ہے)

سارلا۔ لو ہرلش بھی آ پہنچا صبح بھوکا ہی مدرسہ گیا تھا۔ اب میں کیا دونگی اُسے؟

ہرلش چندر۔ (روپیہ دکھاکر) ماتا جی میرے پاس ایک روپیہ ہے۔

سارلا۔ (روپیہ دیکھکر کسی قدر خفگی سے) روپیہ ـــــ؟ یہ روپیہ کہاں سے پایا تو نے ـــ؟ کیا کہیں سے چرالایا ہے۔

سرنیدر۔ ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ کس سے ایسی توقع کی جا سکتی ہے۔

ہرلش چندر۔ نہیں ماتا جی۔ آپ غصّہ نہ ہوں۔ میں سب سچ سچ کہے دیتا ہوں۔ مدرسہ میں میرا ایک دوست شیام کمار ہے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ میں بھوکا ہوں۔ تو اس کی ماں نے ہم دونوں کو بہت سی مٹھائی دی۔ اور شیام کے کہنے سے ایک روپیہ بھی دیا۔ کیونکہ میں نے فیس نہیں ادا کی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس روپیہ میں سے فیس ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے۔ اُس سے میں کتابیں وغیرہ خرید لوں۔

سارلا۔ ہے پرماتما۔ انسان کو تیری بارگاہ سے محروم نہ ہونا چاہئے۔ تیری بخشش بے پایاں اور تیری رحمتیں ان گنت ہیں۔ تیری عنائتوں کا شکر زبان سے ادا نہیں ہو سکتا۔

سرنیدر۔ سارلا ـــ سارلا۔ ابھی دنیا نیک، شریف، ہمدرد اور غمخوار ہستیوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اب بھی ایسے بہت سے ایسے خدا کے بندے ہیں جو دوسروں کے درد اور دُکھ کا احساس کرتے ہیں۔

سارلا۔ ہاں میرے سرتاج ـــ مگر یہ ایک قسم کی خیرات ہے۔ ہم اسے نہ لیں گے۔

سرنیدر۔ سچ کہتی ہو سالار۔ ہمیں مفت ایک پیسہ بھی نہ لینا چاہئے ـــ ہرلش تم یہ روپیہ واپس دے آنا۔ اور کہدینا کہ اب گھر میں پیسے آگئے ہیں۔ روپیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ہرلش چندر۔ لے لینے میں کیا ہرج ہے؟

سارلا۔ بیٹا تم کو نہیں معلوم۔

ہرلش چندر۔ مگر انہوں نے تو خیرات کہکر نہیں دیا۔

سارلا۔ انہوں نے نہ کہا ہوگا۔ مگر یہ خیرات ہی ہے تم جاکر واپس کر آؤ۔

ہرلش چندر۔ ماتا جی۔ مجھے کوئی عذر نہیں اس میں۔

سارلا۔ مگر لاؤ اس وقت مجھے دیدو۔ کہیں تم سے گر نہ جائے کل مدرسہ جاتے وقت لیتے جانا اور واپس کردینا۔

ہرلش چندر۔ مگر فیس کہاں سے دوں گا۔ میں نے اس کیلئے مار بھی کھائی ہے۔

سارلا۔ جب فیس ہوگی تب پڑھ لینا۔ ابھی میں کہاں سے دوں۔ گھر میں بیٹھو۔

ہرلش چندر۔ مجھے گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہنا اچھا نہیں

معلوم ہوتا۔
سارلا۔کہہ تو رہی ہوں جب پیسے آئیں گے تب چلے آنا۔ابھی نہیں ہیں۔
سرنیدر۔اچھا جاؤ ہرلیش اس وقت باہر کھیلو جاکر (ہرلیش چلاجاتا ہے)
سارلا۔مگر اب گھر کا کام کیسے چلیگا۔فاقوں کی نوبت آگئی ہے
سرنیدر۔میں کیا بتاؤں۔ملازمت تو عنقا ہوگئی ہے۔
(سارلا سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگتی ہے۔سرنیدر کسی سوچ میں اُٹھکر ٹہلنے لگتا ہے)
معلوم نہیں یہ گردش کب ختم ہوگی؟ اور چین کب نصیب ہوگا۔
سارلا۔(ہاتھوں میں سونے کے کڑے دیکھکر چپکے سے) کیا ان کو الگ کردوں؟ افسوس پہننے بھی نہ پائی۔
(سارلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں) مگر نہیں مجھے دیدینا چاہئیے (وہ کڑے اُتار لیتی ہے) ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے۔
سرنیدر۔کہو۔خدا کرے مفید ہو۔
سالار۔کہیں باہر جاکر نوکری تلاش کرو۔
سرنیدر۔خرچ کہاں سے آئے؟
سارلا۔(کڑے دیتے ہوئے) لو اس سے کام چلاؤ۔خدا مالک ہے۔
سرنیدر۔آہ سارلا۔سارلا۔یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔میں یہ ہرگز گوارا نہیں کرسکتا۔
سارلا۔نہیں عذر نہ کرو۔میرے پیارے پتی۔ایسا زیور پہننا کس کام کا۔جب کھانے کے لالے پڑے ہوں۔
یہ ہوتا ہی اس لئے ہے کہ وقت بے وقت کام آئے۔
اور اس سے زیادہ اور کون نازک وقت آئے گا۔
زیور اُسی وقت بھلا لگتا ہے۔جب آرام اور چین ہو۔
راحت اور اطمینان نصیب ہو۔تکلیف اور مصیبت کے وقت تو یہ ایک بارگراں معلوم ہوتا ہے۔بس میری خواہش یہی ہے۔کہ تم اسے اپنے مصرف میں لاؤ
میرے سرتاج۔میرا سارا زیور تم ہی ہو۔مجھے کسی اور زیور کی حاجت نہیں ہے۔
سرنیدر۔سارلا۔میں تم سے سخت نادم ہوں۔
سارلا۔آہ اس ندامت کا خیال نہ کرو۔یہ سب تمہارا ہی ہے۔اس کے لینے میں کیوں عذر ہے۔ہماری آئندہ راحت شاید اسی میں مستور ہو۔
سرنیدر۔(بادل ناخواستہ) خیر لاؤ۔بازار میں جاکر فروخت کرتا ہوں۔تم میرے جانے کا سامان ٹھیک کرو۔
(سرنیدر چلاجاتا ہے)

(پردہ)

(غیر مطبوعہ) محشر عابدی

رعایت

سال بھر کا چندہ مبلغ دو روپے بارہ آنے وصول ہونے پر سالگرہ نمبر و عید نمبر مفت ملیگا۔ (منیجر چمن امرتسر)

شانِ تغزل

(جناب سید محمد جعفر حسین صاحب اثر۔ لکھنوی)

جب مر گئے تو پھر ہوسِ وصلِ یار کیا
برگِ خزاں رسیدہ کو فصلِ بہار کیا

لائے گا رنگ مرا دلِ داغ دار کیا
دے گی شگفتگی مرے دل کو بہار کیا

کیا صبر آئے وعدۂ محشر پہ یار کے
واں بھی ملا نہ وہ تو مرا اختیار کیا

دیکھے بچشم خود تو اثر کچھ ہو یار پر
قاصد سنائے اُس کو مرا حالِ زار کیا

مر مر گیا ہوں میں تپشِ ہجرِ یار سے
مجکو شبِ وصال میں آئے قرار کیا

آنکھیں تھیں در پہ میں تھا کہیں روح تھی کہیں
تم پوچھتے ہو حالِ شبِ انتظار کیا

کیوں کر کہوں کہ مجھ سے ملیگا عدو کے گھر
اُس جا کہے گا تو مرا اختیار کیا

ابرو پہ چیں جبیں پہ شکن ہے جو یار کے
قاصد سنا رہا ہے مرا حالِ زار کیا

سب سرگذشت نامۂ پیغام کہہ چکے
اب اور پوچھتا ہے دلِ بے قرار کیا

جب اُٹھ سکے نہ بیٹھ کے کوچہ سے یار کے
مرنے کے بعد اپنا اُڑے گا غبار کیا

مر مر گیا فراق میں لیکن رہا خموش
اب اور اپنے دل پہ مرا اختیار کیا

محشر میں کیا ملیگا نہ آیا جو وقتِ مرگ
وعدہ خلاف تو ہے تیرا اعتبار کیا

(غیر مطبوعہ)

بے نام و بے نشاں ہوں اثر میں میانِ دہر
میرا پتہ بتائے گا سنگِ مزار کیا

(اثر لکھنوی)

نیویارک کا سفر

(جناب مولانا مسعود احمد صاحب بی۔اے)

اگر آپ نے بحر جنوبی کے اس پندرہ روز میں ایک مرتبہ چلنے والے جہاز پر جو کہ جزیرہ لاؤ پر رکتا ہے کبھی سفر کیا ہوگا اس بندرگاہ پر ایک شخص کو سفید سوٹ میں ملبوس جہاز کے کپتان سے بحث کرتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔

جب کبھی کپتان سیلبیج کا جہاز یہاں آکر ٹھیرتا ہارڈنگ سمندر کے کنارے آکر کپتان سے بحث شروع کر دیتا۔ کپتان سیلبیج سب غور سے سنتا۔ اور ہمیشہ آخر میں سر ہلا کر کہہ دیتا۔ "نہیں ہارڈنگ میں تمہیں اپنے جہاز پر سوار نہیں ہونے دوں گا۔"

کپتان سیلبیج اپنے مسافروں کے حق میں بہت ہی نیک طبع اور مہربان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہارڈنگ ایک بدمعاش اور بڑا ناچور ہے۔ لہٰذا اس اندیشہ سے کہ اس کے مسافروں کو تکلیف نہ ہو وہ اسے اپنے جہاز پر سوار ہونیکی اجازت نہ دیتا تھا۔

اب ہارڈنگ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری زندگی اس چھوٹے جزیرہ پر گذریگی۔ اس لئے کہ بحر جنوبی میں چلنے والے جہازوں میں صرف کپتان سیلبیج کا جہاز ہی اس جزیرہ پر ٹھیرا کرتا۔ اور وہ اسے ساتھ لینے میں ہمیشہ قطعی انکار کر دیتا۔ اس صورت کو ۲ سال گذر چکے تھے اور بظاہر کوئی امید اس جزیرہ سے نکلنے کی نہ رہی تھی۔

ہارڈنگ دو سال سے ایک شخص لارسین کے ساتھ ایک چھوٹے سے بنگلہ میں رہتا تھا۔ لارسین نہایت خاموش اور بے لطف طبیعت کا انسان تھا۔ وہ سارا وقت سمندر کو غمزدہ نظروں سے دیکھنے میں صرف کر دیتا۔ اور کوئی کام اسے کرنے کو نہ تھا۔

ہارڈنگ اس طویل صحبت میں اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا۔ کہ لارسین ایک پُراسرار ماضی رکھتا ہے۔ اور یہی سبب اس کے خاموش اور غمزدہ رہنے کا ہے۔ اس میں بھی شبہ نہ تھا۔ کہ لارسین کے پاس روپیہ بھی تھا۔ آخر اس نے یہ بنگلہ کہاں سے خریدا تھا؟ بنگلہ میں ایک پیانو اور ایک گراموفون بھی تھا۔ جو کہ اس جزیرہ میں غیر معمولی تمول کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معمولی اخراجات کہاں سے پورے ہوتے تھے۔ بظاہر آمدنی کی تو کوئی صورت نہ تھی۔ ہارڈنگ سان فرانسسکو اور ساحل باربری کیلئے تڑپتا تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر ناچ گھر اور تماشہ گاہیں دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں بیتاب تھیں!!

~~~~~~~~
~~~~~~~~

وہ دیکھو" ہارڈنگ نے دوربین آنکھوں سے علٰحدہ کرتے ہوئے کہا "کپتان سلیمبچ کا جہاز آرہا ہے۔ میں تو جاتا ہوں

لارسین "اس جزیرہ کی آب و ہوا نے مجھے ایسا کاہل بنا دیا ہے۔ کہ حرکت کرنے کو دل نہیں چاہتا"

اس نے سر ہلا کر یہ کہا۔ اور ایک شراب کا گلاس چڑھا کر بولا" نہیں میں تو یہیں رہوں گا"

~~~~~~

کچھ دیر بعد ہارڈنگ نے جہاز کی ایک کشتی کنارے پر آتی ہوئی دیکھی۔ اس میں صرف ایک مسافر تھا۔ جب کشتی کنارے پر لگ گئی۔ اور مسافر اُتر آیا تو اس نے دیکھا کہ یہ ایک دراز قد کشادہ سینہ کا گورا آدمی تھا۔ اور اس کے چہرہ سے خود اعتمادی ظاہر ہوتی تھی۔ ہارڈنگ نے فوراً گفتگو شروع کر دی۔

ہارڈنگ "آپ کا مزاج اچھا ہے؟ میرا نام ہارڈنگ ہے"

اجنبی "الحمد للہ" اس نے ہارڈنگ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

ہارڈنگ "میں ہر شخص سے بغیر تعارف کے گفتگو شروع کر دیتا ہوں۔ اس لئے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں شاذ و نادر ہی کسی ہم وطن کا گذر ہوتا ہے۔ آپ ہوٹل جائینگے؟

اجنبی "ہوٹل کہاں ہے؟"

ہارڈنگ "وہ۔۔۔ بالکل سامنے ہوٹل کی ہی تو عمارت ہے"

اجنبی نے دوبارہ متجسسانہ نگاہ ہارڈنگ کے چہرہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

اجنبی "میرا نام سنگر ہے۔ جان ڈبلو سنگر"

ہارڈنگ "مسٹر سنگر آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ سان فرانسسکو سے تو نہیں آرہے؟"

اجنبی "جی نہیں نیویارک سے۔ مگر میں وہاں کچھ عرصہ رہ چکا ہوں"

~~~~~~

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں ہوٹل تک پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہارڈنگ نے کہا:۔

ہارڈنگ "آپ کیا پئیں گے؟

سنگر "بہت ہلکی شراب"

ہارڈنگ "بوائے ہلکی شراب لاؤ" پھر اجنبی سے مخاطب ہوکر" ہاں تو نیویارک کا کیا حال ہے؟ اوہ! یہ دو سال کا زمانہ دو صدیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں آپ سان فرانسسکو میں بھی تو رہ چکے ہیں۔ وہاں کی دلچسپیاں تو ویسی ہی ہونگی"

مسٹر سنگر پانچواں گلاس خالی کرنے کے بعد اپنے حواس میں نہ رہے۔ اور یوں تقریر شروع کی:۔

سنگر "ہاں مجھے وہاں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ــــــ (قہقہہ لگا کر) میں پنکرٹن کا جاسوس ہوں۔ ہاں تمہیں وہ نیشنل بنک کی ڈکیتی یاد ہے۔ مجرم نے پہرہ دار کے گولی ماردی تھی۔ چونکہ وہ نقاب ڈالے

ہوئے تھا اس لئے کوئی شخص اس کا حلیہ نہ بتا سکا۔ اور وہ بآسانی بھاگ نکلا۔ مگر تم جانتے ہو کہ پنکرٹن والے بڑے چالاک ہیں۔ ہمیں اس کا نام معلوم ہوگیا ہے۔ آسکر کالنس ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلا ہے۔ کہ وہ اس جزیرہ میں مقیم ہے؟"

ہارڈنگ۔ یہاں لاؤ میں صرف چند پردیسی ہیں اور یہ بڑا آسان کام ہے"

سنگر۔ (بڑبڑا کر) "جب شراب اندر پہنچ جاتی ہے۔ تو عقل باہر بھاگ نکل جاتی ہے۔ مجھے . . . . یہ راز نہ بتانا چاہئے تھا اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ آسکر کالنس تم ہی ہو"

ہارڈنگ "اچھا فرض کیجئے میں ہی سہی۔ تو میں بھی تو جزیرہ سے بھاگ کر نہیں نکل سکتا"

~~~~~~

اس کے بعد ہارڈنگ بھاگا ہوا اپنے بنگلہ پر پہنچا اور دیکھا کہ لارسین باطمینان اپنے شغل میں مصروف ہے۔

ہارڈنگ نے چھوٹتے ہی کہا۔

ہارڈنگ۔ دیکھو میں نے نیویارک پہنچنے کا ایک بڑا اچھا ذریعہ پیدا کر لیا"

لارسین "مگر کپتان سلیچ تو تمہیں کسی طرح بھی اپنے جہاز پر نہ چڑھنے دیگا"

ہارڈنگ "نہیں۔ قصہ یہ ہے کہ یہاں ہوٹل میں پنکرٹن کا ایک سراغرسان ٹھیرا ہوا ہے۔ بڑا معقول آدمی ہے۔ میں نے اسے خوب شراب پلائی۔ اور اس نے سارا راز مجھے بتا دیا۔ وہ ایک مجرم کی تلاش میں یہاں آیا ہے جس کا نام آسکر کالنس ہے۔ اس بدمعاش نے نیشنل بنک کے پہرہ دار کو قتل کر کے پندرہ ہزار ڈالر کی رقم اڑا دی۔

لارسین "ہوں!"

ہارڈنگ "ہاں تو پولیس کو اس کا حلیہ معلوم نہیں۔ صرف یہ معلوم ہے۔ کہ اس کا نام آسکر کالنس ہے۔ اور وہ یہاں رہتا ہے۔ اگر میں کہدوں کہ آسکر کالنس ہوں تو مجھے کون روک سکتا ہے؟ اور جب کپتان سلیچ کا جہاز نیویارک کے قریب پہنچ جائے۔ تو اصل حال بتا دوں۔ کہ یہ ترکیب میں نے صرف نیویارک پہونچنے کے لئے نکالی تھی؟"

لارسین "بڑی عمدہ ترکیب ہے۔ ضرور اسے آزماؤ۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہ کیسے ثابت کرو گے۔ کہ واقعی آسکر کالنس نہیں ہو"

ہارڈنگ "بڑی آسانی سے۔ نیویارک میں میرے بہت سے دوست ہیں جو مجھے شناخت کر لیں گے"

~~~~~~

لارسین تو تکیہ پر سر رکھتے ہی سو گیا۔ مگر ہارڈنگ نے پلک نہ جھپکائی۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا "اللہ جانے اس کے پاس کس قدر دولت ہے؟ آخر یہ جو اس قدر خرچ کرتا ہے تو کچھ نہ سوچا ہی ہوگا۔ غالباً نوٹوں کی گڈی کافی موٹی ہوگی۔ تو اس کا بھی انتظام کر دوں۔ لیکن صبح کو جب یہ بیدار ہوگا اور نوٹ نہ پائے گا۔ تو فوراً مجھ پر شبہ کریگا۔ بھاگ کر میں کہیں جا نہیں سکتا۔ اچھا تو اس کا خود... ہی فیصلہ کیوں

نہ کر دوں اسے کچھہ تکلیف نہ ہوگی۔ بڑی آسانی سے رخصت ہو جائے گا۔"

چنانچہ ٹھیک ڈھائی بجے اس نے لارسین کی کنپٹی پر پستول کی نال رکھکر داغ دی۔ اور پستول وہیں پلنگ کے قریب ڈال دیا تاکہ خودکشی کا شبہ ہو۔ اور نوٹوں کی کافی موٹی گڈی نکال کر چلتا ہُوا۔

صبح سویرے ہارڈنگ ہوٹل پہنچکر سراغرسان سے ملا۔ اور یوں سلسلہ گفتگو شروع کیا۔

ہارڈنگ:۔ میں اس جہنمی جزیرہ پر رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔ اور اب اپنے کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ میں ہی کالنس ہوں۔ جس کی تلاش میں آپ سرگرداں پھر رہے ہیں۔"

سنگر۔ مجھے یہ سنکر بہت افسوس ہوتا ہے۔ کہ تم یہ بھی سمجھتے ہو کہ اس کے معنے ہیں بجلی کی کرسی؟

ہارڈنگ۔ ہاں میں اس کڑوی دوا کیلئے تیار ہوں

سراغرسان نے فوراً اس کی جامہ تلاشی لی۔ اور سب چیزیں اپنے قبضہ میں کرلیں۔ جب جہاز جزیرہ سے دوروز کی مسافت طے کر چکا تو ہارڈنگ نے اصلی بات بتلائی۔

ہارڈنگ۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ آپ میرا راز معلوم کر کے بہت خوش ہونگے۔ یہ بڑا سلیپ مجھے کسی طرح اپنے جہاز پر سوار نہ کراتا تھا۔ میں نے بہت خوشامدیں کیں۔ مگر سب بے سود!"

سنگر:۔ ہاں۔ کہے جاؤ۔"

ہارڈنگ:۔ میرا نام کالنس نہیں ہے۔ یہ ترکیب تو صرف میں نے اس ناپاک جزیرہ سے خلاصی پانے کیلئے نکالی تھی۔ میرا نام تو ہارڈنگ ہے۔ نیویارک میں پچاسوں آدمی ہیں۔ جو میرے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

سنگر نے غصہ سے اسے دیکھا اور سر ہلا کر کہا "نہیں پیارے۔ اب وقت گذر گیا۔ فضول باتوں سے کچھہ نتیجہ نہیں۔ اب تو اپنے کئے کو بھگتنا پڑے گا۔

ہارڈنگ بالکل زرد پڑ گیا۔ اور جہاز کے جنگلہ پر سہارا لیکر بڑی دشواری سے اپنے کو سنبھالا۔ اس لئے کہ اسی وقت سنگر نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالتے ہوئے کہا۔

"ان نوٹوں پر وہی نمبر ہیں۔ جو کہ نیشنل بنک کے غائب شدہ نوٹوں کے نمبر ہیں۔ اگر تم کالنس نہیں ہو تو آخر یہ نوٹ کہاں سے آئے؟ بولو پیارے! بولو!!

۵

ایک آفت سے تو مرمر کر ہُوا تھا جینا
پڑگئی دوسری کیسی مرے اللہ نئی

(غیر مطبوعہ) مسعود احمد بی۔اے

(ترجمہ)

یورپ کی ایک شہزادی

حسن امرتسر

۰ شوه

درِ مقصود

(جناب مولانا سیّد محمد علی صاحب آذر جالندہری)

یاد آئے گی بہت یہ آپ کی محفل مجھے
آپ سے ہو کر جدا جینے نہ دے گا دل مجھے

عشق نے رگ رگ میں ایسا خون پیدا کر دیا
اب نظر آتی نہیں مشکل کوئی مشکل مجھے

میری ناکامی کا باعث ہی تن آسانی میری
دور رکھتا ہے درِ مقصود سے ساحل مجھے

کرتی ہے ہشیار کس کس ناز سے بادِ بہار
دیکھتی ہے جب کسی کی یاد سے غافل مجھے

ہمتِ عالی کی دیکھو حوصلہ افزائیاں
پاؤں کے نیچے نظر آتی ہے ہر منزل مجھے

واہ وا بندہ نوازی آپ کی بندہ نواز
دے دیا سو آفتوں کی ایک آفتِ دل مجھے

اک کھلونا ہوں فقط اک ہستیِ مجبور ہوں
پست کرتا ہے یہی اندیشۂ باطل مجھے

شوق سے پیچھے ڈبو دیجو تو اے موج فنا
اک نظر پہلے دکھا دے منظرِ ساحل مجھے

جو شناسا تھے میرے آذر وہ سارے اُٹھ گئے
محفلِ ماتم ہے اب دنیا کی یہ محفل مجھے

جانگلو

(مزاحیہ مضمون)

(جناب مولانا غلام فرید صاحب قیصر۔ باسنوی)

مرزا نے شاید اپنے لئے کچھ ایسا ہی سمجھ رکھا ہے۔ کہ جبتک دنیا میں سوسائٹی کا وجود قائم ہے کوئی وجہ نہیں۔ کہ میری شخصیت کو نظر انداز کیا جا سکے۔ کیونکہ میں ٹھیرا جانگلو۔ اور جانگلو دنیا سے مٹ جانے والی چیز کا نام نہیں ہو سکتا۔

گویا دنیا کے لئے جانگلو کی شخصیت ایسی ہی ضروری ہے جیسے کالج کے لئے پروفیسر۔ حکومت کے لئے سی آئی ڈی بنئے کے لئے سود۔ شاعر کے لئے مبالغہ۔ اڈیٹر کے لئے مضمون نگار۔ پرچہ کے لئے خریدار۔ اور تعلیم یافتہ کے لئے ٹائمز آف انڈیا۔ کہ نہ یہ اُن سے جُدا ہو سکتے ہیں اور نہ وہ اُن سے الگ۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک چیز کا اپنے ساتھ والی چیز کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عموماً ہر چیز کے لئے کچھ نہ کچھ اہتمام اور الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ مگر جانگلو کی عالمگیر شہرت نہ کسی اڈیٹر کے جنبش قلم کی مرہون منت ہے۔ اور نہ میونسپلٹی کے رسم بت تراشی کی۔ پھر بھی اس کی یاد عام انسانوں کے نہاں خانہ، دماغ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ اور اس کا مجسمہ سب کے دلوں میں انا الموجود، کی برچھیاں تانے ہر وقت لیس کھڑا ہے!

مؤرخین کی گردن پر جہاں بہت سے مشاہیر کا خونِ خود فراموشی سوار ہے۔ ان میں سے ایک جانگلو بھی ہے۔ کہ جس کا نہ کسی تاریخ میں تذکرہ ہے۔ اور نہ اس کے حسب نسب سے کوئی بحث البتہ تاریخ قدیم و جدید میں چند تذکرے ایسے ضرور مل سکتے ہیں جن کو توڑ مروڑ کر خواہ مخواہ جانگلو بنا ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چاہے وہ کوشش مبنی بہ تعصب ہو۔ یا برائے خوشنودیٔ سرکار دولتمدار۔

وہ تو کہو جانگلو کچھ مقدر ہی ایسا لیکر آیا ہے کہ تذکرہ نویس اس کے مٹانے میں جس قدر کوشش کرتے رہے۔ اتنا ہی اس کی شہرت میں اُبھار پیدا ہوتا رہا۔ اور نوبت بہ اینجا رسید کہ آج آدمیوں میں کثرت سے جو چیز نظر آ سکتی ہے۔ وہ اس کی نقلِ ناتمام اور کہیں کہیں "نقل مطابق اصل" ہے۔ جو دفتر کے کلرکوں۔ میونسپلٹی کے چپراسیوں۔ نئی پود کے وکیلوں ٹکٹ ماسٹروں میں بکثرت نظر سے گذرتی رہتی ہے۔ یہ سبکے سب

یا تو جانگلو ہیں ورنہ جانگلو بن جانے کی کوشش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ تاکہ اسمبلی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے پہلے جانگلو بن جائیں ورنہ نئے انتخاب میں بہت سے دبے دبائے جانگلو اٹھ کھڑے ہونگے اور یہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔

جانگلو اپنا پیٹ پالنے کے لئے دنیا کی ہر دوڑ دھوپ میں برابر حصہ لیتا رہتا ہے۔ مگر طبیعت کی افتاد سے مجبور ہے۔ کہ اس کا بانکپن کسی سے لاگ ہی نہیں کھاتا۔ مثلاً نوکری کرنے میں کسی ضابطے کا پابند نہیں۔ بیوپار کرتا ہے تو "سچ بول اور پورا تول" کی مشقت برداشت نہیں کر سکتا دستکاری میں اپنی مصنوعات کو دن بھر لئے لئے بھٹکتا پھریگا۔ مگر "ارزاں فروش و بسیار فروش" کو دردسر سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ اگر ان جھگڑوں سے آزاد ہو تو پھر جانگلو کی شخصیت شتر بے مہار۔ ورنہ آوارہ گرد مویشی سے بالکل ملتی جلتی ہوگی۔ کہ آپ جس گلی میں جائیے جانگلو آپ کو نہایت اطمینان کے ساتھ گھومتا ہوا ملیگا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ کتنی ہی مہتم بالشان مجلس ہو خواہ کیسے ہی ضابطے کا جلسہ لیکن جانگلو اس میں گھسے بغیر نہیں رہتا۔ بہ ایں ہیأت کذائی کہ ہاتھ میں لمبا سا ڈنڈا ہو اور کمر میں چرمی پٹیاں۔ چاہے آپ اسمبلی ہال ہی میں کیوں نہ جلسہ جائے بیٹھے ہوں۔

المختصر جانگلو کی شخصیت آپ کو تھوڑی سی تلاش پر ہر جگہ بہ آسانی مل سکتی ہے۔ البتہ اس کی سرگذشت ان اوراق میں تلاش کیجئے۔ اور پھر اپنے دل میں ٹٹولئے کہ آپ کو آج تک جانگلو سے کتنی بار واسطہ پڑا ہے؟

ہم نے بمعہ احباب بیٹھے بٹھائے دنیا کی دیکھا دیکھی ایک ایسوسی ایشن یا بقول شخصے انجمن نکال کھڑی کی ہے اب ہماری اس انجمن کے مقاصد پر نظر ڈالنے والا اگر جانگلو نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لئے گھن چکر ضرور بن جاتا ہے۔ کیونکہ ہم نے دنیا میں پیش آنے والی کوئی ایسی بات باقی نہیں چھوڑی ہے۔ جو ہمارے مقاصد میں شامل نہ ہو کیونکہ آخر ہر مقصد ضبط تحریر میں آجانے کے لئے ہے۔ اور ہم ہر مقصد کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر ضبط تحریر میں لانے کے لئے۔ رہا کسی کام کا کرنا کرانا سو اس کی نہ ہمیں فرصت ہے۔ اور نہ پبلک کو ضرورت۔ پھر خواہ مخواہ دردسر کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اچھا تو ہماری انجمن کے طویل مقاصد کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑے تو ہر ممبر سے ماہانہ فیس وصول کر لی جائے۔ اور کم از کم مہینے میں ایک بار سب کے سب شہر سے باہر کسی بنگلے میں "ضیافت" کے طور پر خوب گل چھرے اڑا کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ڈکاریں کھاتے ہوئے چلے آئیں۔ اور پھر ایک مہینے تک کامل سکوت کہ نہ کچھ کرنا ہے اور نہ کچھ کرنے کی گنجائش ہے۔

لیکن ایسے موقعہ پر ہر شخص کے دل میں جس چیز کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ جانگلو کی شخصیت ہے۔ کہ مبادا دوستوں کی گلچھپ میں یہ بزرگوار نہ گھس جائیں

ورنہ سارا مزا کِرکرا ہوگا۔ اور نقصان، مایہ کے ساتھ شماتتِ ہمسایہ اور جگ ہنسائی ہوگی۔ سو الگ۔ لہذا چُپ چاپ سامان خورد نوش اور باورچی کا انتظام کرکے دبے پاؤں ہر شخص اس طرح بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے گویا ڈاکہ ڈالنے جارہے ہیں۔ اور وہ بھی دن دہاڑے کہ کہیں پولیس کا جانگلو نہ دیکھ پائے!

مگر جناب ڈر آخر ڈر ہے۔ اور ایسے ثواب کے کام آسمان پر چڑھکر بولا کرتے ہیں۔ آپ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمانے سے پیشتر ذرا دیکھئے تو سہی کیسے مزے کا وقت ہے کہ سب کھانے پک پکا کر تیار ہو چکے ہیں۔ اور انجمن کے تمام شورما آستینیں چڑھا کر رنگ برنگی پلیٹوں کے ساتھ زور آزمائی کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ کھانے کے بعد کا پروگرام تیار ہوتا ہے۔ ابتدائی حیص بیص کے بعد ہی ایک رُکن انجمن تنکے توڑتے ہوئے گردن اٹھا کر فرمانے لگے۔

بھیا جب گھر سے نکل ہی آئے ہیں۔ تو آخر کچھ سیر سپاٹا بھی کرتے ہی چلیں۔ بار بار کون آتا ہے۔ اصل پوچھو تو ضیافت کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ دو گھڑی ہنس بول کر غم غلط کیا۔ کھیلے۔ کودے۔ بے تکلفی میں وقت گذارا اور چل دئے۔ کوئی لقمے توڑنے ہی کا نام تو ضیافت ہونے سے رہا۔ کیوں بشیر صاحب سچ عرض کرتا ہوں نا؟

بشیر۔ ارے صاحب۔ ارادہ تو میرا بھی یہی ہے اور ایک مجبہ پر ہی کیا موقوف ہے۔ آپ ساری پارٹی کو ایمان کا واسطہ دیکر پوچھئے ان سب کے دلوں میں دہی بات ہے جو آپ کی زبان پر ہے۔ لیکن مجبوری اس بات کی ہے کہ آپ کی انجمن میں چند کٹھ ملّا ایسے گھس پڑے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی۔ سچ پوچھئے تو یہ لوگ کچھ ایسے جانگلو ہیں۔ کہ نہ انہیں دین سے واسطہ اور نہ اسلام سے کچھ سروکار۔ بس تھوڑی سی باتیں ایسی گھڑ رکھی ہیں۔ کہ جہاں آپ نے ان باتوں کے خلاف ذرا قدم اٹھا لیا کہ بس اسلام آپ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا اب نہ آپ فرزند توحید ہیں اور نہ برادر اسلام۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ آخر اشرف صاحب نے اتنی کوشش اور جاں فشانی سے جو چیزیں مہیا کی ہیں اُن کا کیا حشر ہوگا؟

اشرف۔ حشر کیا ہوتا؟ ابھی طبلے پر تھاپ پڑیگی اور بھئی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو دلربا اور استاد سے چھیڑ چھاڑ کئے بغیر اپنا تو کھانا ہضم ہونے والا نہیں۔ یہ گلے باز گانے والے) بھی آگئے ہیں۔ تو کوئی محروم تھوڑے ہی رہیں گے۔ اور ہاں یہ تو فرمائیے اتنے اچھے فونوگراف کو حاصل کرکے دو چار حقانی چیزیں نہ سننا پرلے درجے کی حماقت نہیں تو اور کیا؟

الغرض چند دوستوں کو مجلس سماع کا ڈول ڈالتا ہُوا دیکھکر مجید صاحب فرمانے لگے۔

مجید۔ یارو۔ ہم لوگ تو شکار کا انتظار کرکے گھر سے نکلے ہیں۔ کچھ تھوڑے آدمی بھی جنگل میں پہنچ چکے ہیں۔ اور شکار کا سارا سامان ہمارے پاس تیار ہے بھلا بتاؤ تو سہی اس طرح لدلدا کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور اب

ہاتھ ملتے ہوئے تھوڑے ہی واپس جانے والے ہیں۔ بلا سے کوئی شکار ملے نہ ملے مگر جنگل کی خاک چھانے بغیر ہمارا احرام شکار اُترنے والا نہیں۔ آپ اس کان سنیں یا اُس کان ہم تو شکار کو جانے ہی والے ٹھیرے۔

منظہر۔ جی ہاں۔ اور کیا۔ بھئی ہم تو گانا بھی سنیں گے کشتی بھی ہوگی۔ شکار بھی کرینگے۔ کوئی چوری چھنالے کی بات تھوڑی ہے۔ کہ خواہ مخواہ کسی کا ڈر ہو۔ میں آپ صاحبوں کو خوشخبری سناتا ہوں۔ کہ آج ہمارے جلسے میں مرزا موجود نہیں ہے۔ ورنہ بات بات پر روک ٹوک کرنے اور قدم قدم پر اپنی جانگلوئیت کا اثر ڈالنے میں ہم کو دباتا جائے۔

شفیق۔ مرزا غریب آتا بھی کہاں سے اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہونے دی۔ اتنے ہوشیار رہ کر کام کیا ہے کہ بس حد کر دی ہے۔ میں بازار میں سودا سلف لے رہا ہوں۔ مزدور کے سر پر سامان کا ٹوکرا رکھا ہُوا ہے ذرا چائے شکر لینے کو بازار کی طرف مڑا دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب کھڑے ہوئے اپنی بکری کے لئے گھاس مول لے رہے ہیں۔ جونہی میری نظر پڑی کہ میں ایکدم ٹھٹکا اور گلی کے نکڑ پر دبک کر تاکنے لگا کہ کہیں مجھے تو مرزا نے نہیں دیکھ پایا۔ بارے کچھ ایسی بات نظر نہ آئی۔ تو چائے شکر کو باقی چھوڑ کر اُلٹے پاؤں میں وہاں سے سرک آیا

قاضی۔ ارے صاحب۔ ایسے موقعہ پر اکثر دیکھا ہے کہ مرزا ایک جیتا جاگتا ولی ہے۔ ایسی باتوں کی اس کو کہیں سے بھی سُن گُن ضرور مل ہی جاتی ہے۔ دیکھئے نا ابھی رمضان کے مہینہ میں افطاری کے موقعہ پر سب نے مل کر کتنی کوشش کی تھی۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ لیکن مرزا ہے کہ وہاں بھی آموجود ہُوا۔ یوں مرزا اپنا دوست ہے بے تکلفی کی صحبت میں آدھکے اور چُپ چاپ بیٹھ رہے تو خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ آتے ہی کچھ ایسے ہی زٹل قافیے شروع کر دیتا ہے۔ کہ بس اس کا مُنہ نوچ لیا جائے۔ اور تو اور خود ڈپٹی صاحب جن کے مکان پر ہنگلے بیٹھا تھا خود اُنہی کے متعلق بھرے مجمع میں کہنے لگا:-

ڈپٹی صاحب آپ کی یہ پُر تکلف افطاریاں یار لوگوں کی تفریح کا سبب ضرور بن جاتی ہیں رہا نجات کا سامان تو وہ آپ کو ان طشتریوں میں اور گلاسوں میں ملنا مشکل ہے۔ غور فرمائیے سال بھر تک آپ پبلک کے حق میں اچھے خاصے عزرائیل بنے پھرتے ہیں۔ اور رمضان کے مہینے میں "نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی" میری رائے میں آپ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور حق، حق میں تمیز کیجئے جو یقیناً ان پلیٹوں کے کھڑکانے سے آپ کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

غضب خدا کا کتنے ہی دوست تھے کہ خون کا گھونٹ پی کر چُپ ہو رہے۔ اِدھر ڈپٹی صاحب کو کاٹو تو خون نہیں مجھے بھی ایسا تاؤ آیا کہ اس جانگلو کو آہستہ سے اٹھا کر بندرابن

کے جنگل میں رکھ آؤں۔ کہ بندروں کے لئے ایک تماشہ ہو۔ سارے جلسے میں ادہر سے اُدہر تک سناٹا تھا۔ مگر مرزا صاحب ہیں کہ لکچر اور لقمے برابر جاری ہیں اور فالودہ کا گلاس ہے کہ مُنہ سے ہٹنے ہی نہیں پاتا کہنگار رہے ہیں۔ اور غٹا غٹ فالودہ چڑھا رہے ہیں۔

رونق۔ ہاں صاحب ہاں۔ یہ جلبنی قسم کے بھی جانگلو ہیں خدا ان سے محفوظ رکھے۔ دیکھئے نا۔ خدا نخواستہ اگر کے پبلک کو پولٹیکل جانگلو کے جنگل سے کچھہ تھوڑی بہت نجات ملی بھی کہ اب یہ مذہبی جانگلو نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ابھی ان کا قدم پورے طور پر جمنے ہی نہیں پایا تھا۔ کہ پھر آجکل تحریری جانگلو پیدا ہو چلے جن کو مضمون نگاری کے خبط نے اسقدر اندہا بنا رکھا ہے۔ کہ کچھہ نہ پوچھئے ہر پرچے میں آپ کو ایک آدھ جانگلو ضرور نظر آئے گا۔ اگر اس تحریری جانگلو نے زٹلی قافیے کو کہیں میر جعفر زٹلی دیکھہ پائیں۔ تو ہمیشہ کے لئے گوشۂ قبر میں منہ چھپا کر بیٹھہ رہیں۔ بس اتنا ہی سمجھئے کہ ہر رنگ کے جانگلو کو سیدہی طرح بات کرنا تو آتا ہی نہیں۔ جب دیکھو بے پَر کی اڑاتا ہُوا پاؤگے۔

ہم۔ خیر صاحب۔ اب اس داستان کو ختم کیجئے کیونکہ یہ سب فرصت طلب باتیں ہیں ابھی دسترخوان کا معرکہ سر کرنا باقی ہے۔ چلئے پہلے وہاں مورچہ جمادیں۔ اور ہاں اب بالاتفاق یہ فرمائیے۔ کہ کھانے کے بعد کیا پروگرام ہے؟

اشرف۔ آہا ہا ہا۔ ہمارے مولانا بھی نرے جانگلو ہیں۔ سارا قصہ سُن لیا مگر یہ پتہ نہ چلا کہ زلیخا مرد تھی کہ عورت تھا۔ ارے صاحب پروگرام کیا ہوتا ذرا کھانے سے فرصت پالینے دیجئے پھر دنیا بھر میں زندہ دلی کے جس قدر بھی مشاغل ہیں وہ سب کے سب یکے بعد دیگرے نمٹے جائینگے دیکھئے رستم کی یاد بھی تازہ ہوگی۔ تان سین کی قبر پر پھول چڑہائے جائیں گے۔ قیس عامری کی تقلید میں دشت نوردی کے بھی کچھہ مزے لوٹیں گے۔ گھومنا۔ پھرنا۔ اچھلنا۔ کودنا۔ ہشت مشت۔ کشتم پچھاڑ۔ دوڑ بھاگ۔ ہا ہُو۔ دانتا کلکل۔ گلے بازی اور لقمہ نوازی غرض ہر چیز کے پورے مزے لئے جائیں گے۔ تب کہیں جاکر یہ قافلہ گھر کو لوٹیگا۔ انجمن ہے کوئی دل لگی تھوڑی ہے۔ کہ احدیوں کی طرح آئے اور طشتریاں چاٹ کر پیٹ پر ہاتھ پھراتے ہوئے گھر کو چلدیئے سمجھہ گئے مولانا۔ یہ سب کچھہ ہوگا اور وہ بھی اسی جنگل میں اور پھر وہ بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے فرمائیے آپ کو "چمن" کے لئے مضمون لکھنے سے ان تمام باتوں میں شریک ہوکر لطف زندگی حاصل کرنے کی بھی فرصت نصیب ہوگی یا نہیں۔

ہم۔ بہت بہتر ہے شرکت کیوں نہ ہوگی سچ پوچھئے تو ہمیں ایسی صحبتیں بخت و اتفاق ہی سے نصیب ہوتی ہیں ہمارے لئے یہ باتیں محض اتفاقی ہیں جو نعمتات سے کسی طرح کم نہیں۔ رہا۔ "چمن" کے لئے مضمون لکھنے کا معاملہ سو یہ کوئی چلہ کشی کا کام تو ہے نہیں کہ پورے چالیس دن میں جاکر ختم ہو۔ ہنر صاحب کے ارشاد کو سر چڑھانا تھا سو چڑھا لیا۔ لیجئے ختم کئے دیتے ہیں۔ چلئے دسترخوان تیار

ہے۔کہیں آپ کی گنتی میں فرق نہ پڑ جائے۔

اس کے بعد ہی سب کے سب دسترخوان پر حاضری کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُٹھتے ہی انگڑائیاں لے کر ابھی پہلا قدم اُٹھانے بھی نہیں پائے تھے۔کہ سامنے سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر رجال الغیب کی طرح وہ بزرگوار بھی نمودار ہوئے جن کی طرف سے سب کی طبیعتوں میں کھٹکا لگا ہُوا تھا۔

یعنی خطیب الملک۔تنقید نواز۔گڑبڑ جنگ مرزا جانگلو خلد اللہ ژٹلیا تہٗ بہ ایں ہیئت کہ بغل میں گھانس کی پولی دبی ہوئی ہے۔مُنہ میں ایک ایسی بیڑی جو غالباً جی آئی پی کے ورکشاپ میں بنی ہو۔ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا اور سر پر شملہ بہ مقدار رحیاں لمبی لمبی چھلانگیں مارتے عبائے جانگلوئیت کے دونوں پردے ہُوا میں اُڑاتے اس بے ساختگی سے لپکے چلے آ رہے ہیں۔گویا آتے ہی ہم سب کو نگل جائیں گے۔اور نگلنے کو کچھ نہ ملا تو پھر سب کو عبور دریائے شور کا حکم ضرور سنا ڈالیں گے۔

مرزا صاحب کو دیکھتے ہی ہم سب کی یہ کیفیت تھی۔کہ خاموش کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں گویائی کی قوت سلب ہو چکی۔اور تھوڑی دیر کے لئے ہم سب کے حواس معطل ہو کر رہ گئے۔ہر ایک اپنی اپنی جگہ بے انتہا نادم اور یہی چاہتا تھا کہ زمین شق ہو اور سب سے پہلے میں اس میں سما جاؤں۔کیسی حماقت ہے کہ ضیافت جیسی تقریب اور مرزا کو دعوت نہیں۔اب اس فضیحتے کو دیکھئے کتنے رنگ بدلتا ہے

ایسے میں مرزا صاحب بھی آن پہونچے۔اور علیک سلیک کے بعد اپنے مخصوص رنگ میں فرمانے لگے:۔

ارے یارو! زمانے کا خون اب اس قدر سفید ہو چلا۔ کہ سیدھی اور سچی باتوں میں بھی لوگ چوریاں کرنے لگے۔ مرد آدمی ہم کوئی ایسے گئے گذرے تو ہیں نہیں کہ دو گھڑی کو دوستوں میں شریک نہ ہو سکیں۔جانے تم لوگوں کو ہمارے ہی ساتھ کیا دشمنی ہے کہ خواہ مخواہ رو ٹھے جا رہے ہو۔یوں تو روز دن رانہ جھک مارنے ہمارے پاس چکر کاٹتے رہتے ہو کہ مرزا صاحب ذرا یہ کام اور مرزا صاحب ذرا وہ کام۔لیکن جہاں ذرا مل بیٹھنے کا موقعہ ہُوا کہ مرزا صاحب کو بالکل اس طرح نکال پھینکا جیسے دودھ میں سے مکھی نکال پھینکتے ہیں۔ ہم بھی تمہاری ہی جیسی کر گذریں مگر کم بخت طبیعت ہی ایسی ہے کہ جس سے ملئے صاف دلی سے ملئے۔تم انگریزی داں کچھ ہو بھی احسان فراموش کہ فوراً ہی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیا کرتے ہو۔ذرا بولو تو سہی یہ کیا حماقت تھی کہ سب کے سب اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر جنگل کو نکل بھاگے اور مجھکو خبر تک نہیں کی۔

مرزا صاحب! آپ نے بھی عجیب وہمی طبیعت پائی ہے کہ ذرا سی بات کا تبنگڑ بنا لیا کرتے ہو۔ارے بھائی بات صرف اتنی ہی تھی۔کہ آج ہم سب نے آزمائش کے طور پر یہ دیکھا کہ چلو ہمیشہ مرزا صاحب کو ساری جھنجھٹ سونپ دیا کرتے ہیں۔ایک مرتبہ سارا انتظام مرزا صاحب کی غیر موجودگی میں بھی کر دیکھیں کچھ ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں۔باقی تم کوٹا لنا

اگر کوئی چیز کھائی ہو تو قسم لے لو۔ دیکھو کھانا تیار ہے۔ مگر صرف تمہارے ہی انتظار میں سب رکے ہوئے ہیں۔ لڑکا تمہیں بلانے گیا ہے۔ شاید راستہ ہی میں ملا ہوگا۔

ہاں۔ کھانا تیار بھی ہو چکا۔ اچھا ہم بھی دیکھیں تمہاری جیرائی یہ کہکر مرزا صاحب باورچی کی طرف لپکے اور کھٹ سے چبوترے پر چڑھکر۔ ابے نورا۔ تیرا باپ تو اعلیٰ درجہ کا کاریگر تھا خدا جانے تو نے بھی کوئی کمال حاصل کیا یا نہیں۔ آج اب تیرا ہنر دیکھتا ہوں ـــ ہے ہے۔ یہ بریانی پکائی ہے۔ توبہ نعوذ باللہ۔ ارے کم بخت یہ تو تو نے سارے مال کا ستیاناس کر دیا اسے کھائیگا کون۔ یہ بھی کوئی انسانوں کے کھانے کی چیز ہے۔ مردار کہیں کے بیلوں کو کھلائیو یہ تیری بریانی۔

اور زردہ دیکھئے۔ اے سبحان اللہ۔ نظر نہ لگ جائے اے مردود مجھے کیا کھڑا گھور رہا ہے یہ ساری دیگ خاک میں ملا دی۔ اور یہ سالم مرغیاں بنائی ہیں۔ ظالم کچھ تو خیال کیا ہوتا کہ اس مال پر پیسے خرچ ہوئے ہونگے۔ اُلو کے پٹھے انکی مچھلا ندبھی پورے طور پر دور نہیں ہونے پائی۔ غصہ تو ایسا آتا ہے کہ ہاتھ ہی قلم کر ڈالوں

اور یہ کباب بنائے ہیں؟ کہ ہو بہو گدھے کے لینڈ ہے (مرزا خدا تجھے سمجھے)

باورچی کی جھڑتی لینے کے بعد مرزا صاحب ہمارے سامان گمت کی طرف بڑھے۔ سارنگی پر ہاتھ رکھتے ہی غصہ میں تڑاک فرمانے لگے۔ ہائیں یہ کیا سامان ہے۔ غضب خدا کا۔ میں تو سمجھا شاید مصر کی ممی ہاتھ لگ گئی ہے۔ کہ اتنے احتیاط سے لپیٹ کر رکھی ہو۔ یہ سارنگی۔ طبلہ وغیرہ دیکھکر پورا یقین ہوتا ہے۔ کہ بی مشتری جان بھی کہیں دبک دبکا کر بیٹھ رہی ہیں۔ اب آئی بات سمجھ میں غریب مرزا کو صرف اسی لئے ٹال رکھا تھا کہ ہماری صحبت میں مخل نہ ہو۔ کیوں صاحبو یہ پرہیزگاری کے سارے سامان اسی نیت سے اکٹھے کئے تھے نا۔

اور یہ بندوق اور کارتوس کیوں نظر آتے ہیں۔ اُف۔ اب تو آپ لوگ بڑے اونچے اُڑنے لگے۔ "باپ نے ماری مینڈکی اور بیٹے تیر انداز" شاید شکار کے ارادے ہیں۔ ہاہاہا۔ تمام ہرن اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے آپکے منتظر ہیں۔ جائیے اور چھکڑے بھر بھر کر شکار لے آئیے۔

غرض کہ صاحب کہاں کا کھانا؟ اور کیسی ضیافت؟ مرزا کی بے تکی لعن طعن تھی اور ہم ناکردہ گناہ غریبوں کی گردن۔ ہنر صاحب کوئی ایسا منتر بتائیے۔ کہ ایسے جانگلو سے نجات ملے تب کہیں آپ کے پرچوں میں اطمینان کے ساتھ مضمون لکھا جا سکے۔ ورنہ ہم ہیں اور ایک نہ ایک جانگلو ہر وقت موجود!

(غیر مطبوعہ) **غلام فرید قیصر**

کیفیات

(منشی عبدالخالق صاحب کیفؔ دہلوی)

بعد فنا بھی ہے یہ اثر اضطرار کا
ہر ذرّہ بے قرار ہے میرے مزار کا

ٹھنڈی ہوا ہے اور ہے موسم بہار کا
ساقی پلا دے جام مئے خوشگوار کا

ہر داغ مثلِ گل ہو دلِ داغ دار کا
یعنی خزاں میں رنگ ہو پیدا بہار کا

یہ اعتبارِ وعدۂ دیدار دیکھئے
برسوں سے انتظار ہے روزِ شمار کا

سازِ دل شکستہ سے نغمے اُبل پڑے
مُژدہ سُنا جو آمدِ فصلِ بہار کا

اے آئینہ صفت ہے یہ گردِ ملال کیوں
کچھ آئینہ میں کام نہیں ہے غبار کا

تاراج ہو گئی مری دُنیائے آرزو
میں بھی ہوں شکوہ سنج غم روزگار کا

وہ ٹالتے ہیں وعدۂ دیدار حشر پر
اب انتظار کیجئے روزِ شمار کا

ایک ایک آبلہ ہو مرے دل کا خونچکاں
کیا یہ علاج ہے خلش نوک خار کا

ساقی نگاہ مست کے طالب ادھر بھی ہیں
ہاں اس طرف بھی جام مئے خوشگوار کا

پیہم ٹپکتے ہیں مری آنکھوں سے اشک خوں
اے کیفؔ دیکھتا ہوں تماشا بہار کا

(غیر مطبوعہ)

عورت کی حیثیت

بہ زمانۂ جاہلیتِ عرب

(جناب مولانا ظہیر الدین صاحب تاج زبیری)

فی زمانہ طبقۂ نسواں کو بے بس مخلوق کہنا غالباً غلط نہ ہوگا۔ آج کل اس طبقہ کو اُسی قدر حقیر اور ناچیز خیال کیا جاتا ہے۔ قطعاً جیسے ایک اسیر پرندہ جس میں قوتِ پرواز موجود ہو لیکن پرواز سے معذور۔

میں سوال کرتا ہوں کیا صنفِ نازک کا ہم جیسے انسانوں میں شمار نہیں؟ کیا ہماری گنتی نسبتاً بلند تر ہے؟ یا اس طبقہ کے پہلو میں دل، دل میں تڑپ اور تڑپ میں بے ساختگی، وجذبۂ غیر اختیاری نہیں؟ نہیں! ہے اور ضرور ہے بلکہ ہم سے کہیں زیادہ۔ پھر کیا وجہ ہے۔ کہ اس کو آزادی کا مستحق نہیں قرار دیا جاتا؟

انسانی زندگی اُس وقت تک زندگیٔ کامل نہیں کہی جا سکتی جب تک عورت و مرد کے حقوق کا پلہ برابر نہ ہو کیونکہ اِن دونوں کے ارتباطِ حقوق سے معاشرت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور اسی لئے اس دورِ حیات کو حقیقی زندگی تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

میں یہ جانتا ہوں، کہ مذہبِ اسلام نے بہ لحاظِ رتبہ ودرجہ عورت پر مرد کو فوقیت دی ہے۔ لیکن دستِ قدرت نے ہر ایک کو یکساں اور مساوی حصّہ عطا فرمایا ہے۔ مردوں کو خدائے لم یزل نے حواسِ خمسہ کا مالک قرار دیا ہے اسی طرح عورت کو بھی۔

دورِ حاضرہ میں ایشیائی دنیا کا دیرینہ فلسفہ "عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں" غلط ثابت ہو رہا ہے۔ کیا یہ ثبوت ناکافی ہے۔ کہ جب یدِ قدرت نے دونوں کو یکساں بنایا ہے۔ تو عورت و مرد کو حصّۂ عقل بھی برابر مرحمت فرمایا ہوگا۔ زمانۂ حال پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جوں جوں زمانہ ترقی پذیر ہوتا جاتا ہے مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ترقی کی راہ میں قدم بہ قدم ہیں۔ اور علمی، اخلاقی، صنعتی اور تجارتی لائن میں بھی مردوں کے دوش بدوش۔ مرد اگر باہر کا مالک ہے تو عورت گھر کی حاکمہ ہے چار دیواری کے اندر وہ قطعاً خود مختار ہے۔ جیسے ایک بادشاہ اپنے قلعہ بلکہ تمام سلطنت میں انتظامِ حکومت کو تبدیل کر دینے پر قادر ہے۔ اسی طرح

عورت بھی نظامِ خانہ بدل دینے سے مجبور نہیں۔

جس وقت دن بھر کا تھکا ماندہ مرد مکان میں داخل ہوتا ہے۔ تو شوہر پرست بیوی اُس کے روبرو سرِ اطاعت خم کر دیتی اور ایسی محبت آمیز نظریں اُس کے چہرہ پر ڈالتی ہے۔ کہ وہ دن بھر کی کلفت و صعوبت کو فراموش کر دیتا ہے یہ خوبی اور وصف خدا نے صرف عورتوں کو عطا فرمایا ہے۔ کہ وہ نگاہوں سے ترجمان کا کام لیں آپس کی رنجش اور کبیدہ خاطری کے بہت سے ذرائع ہُوا کرتے ہیں۔ مثلاً دفتر میں کسی افسرِ اعلیٰ نے معمولی سی بات پر برخاست کر دینے کی بے معنی دھمکی دی۔ میاں ملول و افسردہ مکان واپس ہوئے۔ اُدھر بیوی کے محض لاعلم ہونے کے باعث کوئی بے موقع بات پیش آگئی بس! پھر کیا تھا۔ برس پڑے۔ دفتر کا تمام غصہ غریب بیوی پر اُتارا۔ تو وہ شام بھی خوشی اور لطافت سے محروم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

عورت کا دل نہایت نازک ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بہت جلد ہر قسم کے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ اور اسیطرح اُن خیالات سے دل کو بہت جلد پاک بھی کر سکتی ہے۔ مرد کی جانب سے چاہے جیسی بے عنوانی ہو جائے خواہ کیسی ہی ناراضگی اور خفگی ہو لیکن عورت ہی مرد کو پہلے منانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ دراصل عورت محبّت و وفا کی پاک دیوی ہے۔ اسی عورت کا نام بہشت میں حور ہے عورت ہی زندگی میں بہترین خوشی ہے اور زیست بھر کی مونس و غمخوار۔ عورت کا دل رحم کا مسکن و خزانہ ہے ہم عورت ہی سے آرام و شائستگی اور حوصلہ مندی کا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

بعض امیر گھرانوں میں عورتوں سے گھر کا کام کاج نہ لینا ناز برداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اُس کے نتائج فی الواقع خراب ہیں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دستکاری سیکھنا عورتوں کے لئے لازمی ہے۔ تاکہ وہ بیکار ہی نہ رہیں۔ بلکہ کوئی شغل کرتی رہیں۔ جو عورتیں مردوں کے تفکرات اور اہم کاموں میں مدد دیتی ہیں۔ وہ قابلِ صد تحسین و آفرین ہیں۔

عام لوگوں کا خیال ہے۔ کہ اہلِ عرب طبقۂ نسواں کو بہ نظرِ تحقیر دیکھتے تھے۔ یہ اُن پر اگر دستِ ظلم دراز کرنا اور سراسر تہمت لگانا نہیں تو اور کیا ہے؟ اُن کے اشعار کا دفتر شاہد ہے کہ وہ عورت کی حرمت و عزت کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے (اس کے ثبوت میں عرب شعراء کے اشعار بھی آئندہ کبھی بشرطِ زندگی پیش کئے جائیں گے) وہ ملک میں اپنا نام بذریعۂ اشعار روشن کرتے تھے۔ یعنی شعراء اور سردارانِ قبائل اپنی ہمت و شجاعت اور کرم و سخاوت کی مدح خوانی کرتے تھے۔ تو مخاطب عورت ہی کی جانب ہوتا تھا۔ اگر عورت کسی بات پر لعنت ملامت کرتی تو قصائد میں نہایت نرمی کے ساتھ اور لطیف سے لطیف پیرایہ میں اس کا جواب دیا جاتا تھا۔ یہ عام بات ہے۔ کہ ربّۃ البیت یعنی خانہ دار وغیرہ معزز القاب سے خطاب کرتے تھے۔ اکثر اُس کا ذکر بجائے نام کے کنیت کے ساتھ کرتے تھے۔ جو

جو اُن کے نزدیک علامتِ تعظیم تھی۔ وہ اپنے آپ کو اُسی قدر افتخار کے ساتھ اپنی ماں کی طرف منسوب کرتے تھے جس قدر فخر کے ساتھ اپنے باپ کی جانب۔

اس میں شک نہیں کہ اُن کے یہاں مردوں کو عورتوں پر فوقیت اور عظمت ضرور حاصل تھی لیکن اسمیں ذرا کلام نہیں۔ کہ وہ طبقۂ نسواں کا احترام کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عرب شعراء کے اشعار میں عورت کی حقارت و توہین کی جھلک بھی نہیں پائی جاتی۔ اور شعراء اپنے زمانہ کی زبان ہوتے ہیں۔ طلاق کا اختیار مرد کو حاصل تھا لیکن بعض شریف قبائل کی لڑکیاں بوقتِ نکاح یہ شرط کر لیتی تھیں کہ طلاق اُن کے ہاتھ میں ہوگی۔ مرد بھی اُس کی منظوری میں شمہ برابر دریغ نہیں کرتے تھے۔

دراصل یہ صحیح ہے کہ اہلِ عرب لڑکوں کی پرورش لڑکیوں کی نسبت زیادہ الفت و محبت سے کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ قبیلہ کے وقار کی محافظت کریں اور بمقابلۂ دشمن سپر بنیں۔ اسی لئے اُن کے نام اکثر درندوں کے نام پر تجویز کئے جاتے تھے۔ مثلاً اسد۔ فہر۔ ذئب۔ یعنی شیر۔ چیتا۔ بھیڑیا وغیرہ۔

لڑکیوں کو واقعی بعض لوگ پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ یا اور کسی ذریعہ سے مار ڈالتے تھے۔ لیکن یہ ناجائز رسم تمام ملک عرب میں رائج نہ تھی۔ بلکہ صرف بمیم کے چند ادنیٰ قبائل میں ایسا ہوتا تھا۔ جو ننگ و عار اور زیادہ تر مفلسی و محتاجی کے سبب اور خوف سے ایسا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ بات فطرتِ انسانی کے برعکس تھی اسلئے شرفائے تمیم اس کو ناپسند کرتے تھے۔ بعض خدا ترس لوگ ایسے بھی تھے۔ جو ان غرباء کو جو لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا چاہتے تھے۔ زر و مال دیکر خوش حال کر دیتے تھے۔ تاکہ وہ اُن کی پرورش بہ آسانی کر سکیں۔ یوں تو اکثر اشخاص نے اس کارِ نیک میں حصہ لیا لیکن شاعر فرزدق کا دادا غالب بن صعصعہ نے اس کوشش میں خاص طور سے حصہ لے کر نام پیدا کیا اور شہرت حاصل کی۔

شعرائے عرب کے اشعار سے طبقۂ نسواں کا عربی قبائل میں یہ اثر بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس طبقہ کی خفگی اور ناراضگی کے باعث قبائل مستعدِ جنگ و پیکار ہو گئے ـــــ اور اس ہی کی کوشش سے لڑائیاں بند بھی ہو گئیں۔ . . . اُس کا اندازہ مندرجہ ذیل سے بخوبی ہو سکتا ہے :۔

"عمرو بن منذر" ملکِ حیرہ نے جس کی ماں "ہند" سابق فرمانروائے حیرہ حارث کندی کی لڑکی تھی۔ ایک دن اپنے ہم جلیسوں سے کہا کہ عرب میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔ جس کی ماں کو میری والدہ کی خدمت کرنے سے گریز ہو۔ ہم نشینوں نے جواب دیا کہ اور تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔ لیکن "عمرو بن کلثوم" جو قبیلۂ تغلب کا سردار ہے۔ اُس کی ماں "لیلیٰ" شاید آپ کی والدہ کی خدمت کرنا پسند نہ کرے کیونکہ اُس کا باپ۔ چچا۔ شوہر اور بیٹا ہر ایک نامی اور مشہور سردار ہے۔" عمرو بن منذر" نے "عمرو ابن کلثوم" اور اُس کی ماں "لیلیٰ" دونوں کو بہ حیلۂ دعوت بلایا وہ اپنے قبیلہ کے

لوگوں کے ساتھ آگر خیمہ زن ہُوا۔ "عمرو ابنِ منذر" نے اُس دیار کے امراءِ قبائل کو بھی جمع کیا۔ اور بہت دہوم دہام کے ساتھ ضیافت کی۔

وہ اپنی ماں ہند سے پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ کہ جب "لیلیٰ" تمہارے پاس آئے تو اُس سے کوئی کام لینا چنانچہ "لیلیٰ" جب "ہند" کے خیمہ میں گئی تو باتوں باتوں میں "ہند" نے ایک طباق کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ طباق مجھے اٹھادو۔"

لیلیٰ نے جواب دیا "جس کو ضرورت ہو وہ خود اٹھالے۔" اُس نے اصرار کیا اس پر لیلیٰ چلا اٹھی "ہائے ذلت ہائے ذلت" اور اپنے قبیلہ کا نام لیکر پکارا۔

"عمرو ابنِ کلثوم" اس وقت "عمرو ابن منذر" اور دوسرے روسار کے ساتھ قریب ہی کے خیمہ میں مشغولِ مے نوشی تھا۔ جب اُس نے یہ آواز سُنی۔ تو اس کا چہرہ غصّہ سے سُرخ ہوگیا۔ اٹھکر "عمرو ابن منذر" کی تلوار جو خیمہ میں لٹک رہی تھی اتار لی۔ اور اُسی جگہ "عمرو ابن منذر" کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد اپنا فخریہ قصیدہ کہا۔ جو سبعہ معلقہ میں شامل ہے۔

کیا اب بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اہلِ عرب کی نظر میں عورت کی کچھ عزّت ووقعت نہیں تھی؟ ایک عورت کے صرف "ہائے ذلت ہائے ذلت" پکار اٹھنے پر اپنے میزبان کو قتل کر دیا۔ ایسا کیوں ہُوا؟ صرف ایک عورت کی توقیر کی خاطر۔

(غیر مطبوعہ)

تاج زبیری

رہ گیا

(ابو القاسم جناب میر کرامت صاحب نمیر امرتسری)

چلتے چلتے اُس کا خنجر زیرِ خنجر رہ گیا
دیکھنا کیسا مقدر سے مقدر رہ گیا

وادیٔ وحشت میں میرے ساتھ تھا جالِ خضر
دو قدم چلنے نہ پایا تھا کہ تھک کر رہ گیا

کیا برابر کی ہوئی ڈھوٹ حسن ابدال میں
جو گرا تھا کوہ کی چوٹی سے پتھر رہ گیا

سچ ہے جس کا جو مقدر ہے وہ ملتا ہے ضرور
خضر نے پانی پیا، پیاسا سکندر رہ گیا

دل چرانے والے کا جب کچھ نہ ہاتھ آیا سُراغ
چل پڑا الوٹا تو اُس کا نام سنکر رہ گیا

کوئی دم میں آیا ہی سمجھو یہ پیغامِ اجل
بستر قاتل رگِ جاں میں اُتر کر رہ گیا

میری حالت کا اسی سے ہم نشیں اندازہ کر
کانپنے سے ہاتھوں سے گرتا گرتا ساغر رہ گیا

(غیر مطبوعہ)

(مشاعرہ بزم سرش لاہور)

اگلی بہار

(از جناب پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ)

تھا اعتبار وعدۂ بے اعتبار تک
جیتا رہا اخیرِ دمِ انتظار تک

کس کو نصیب ہوتے ہیں پھر جلسہ ہائے عیش
جیتا ہے کون دیکھئے اگلی بہار تک

دیکھو ستم کہ بہرِ دعائے وصالِ غیر
وہ پاؤں چل کے آئے ہیں میرے مزار تک

تم بھی کرو نہ جبر مری جان اس قدر
ہم بھی کرینگے صبر مگر اختیار تک

شکوہ نہیں ہے نخوتِ گل ہی کا اے وفاؔ
مجھ سے چمن میں نوک کی لیتے ہیں خار تک

(غیر مطبوعہ)

زمزمۂ تغزّل

(حضرت مولانا ابوالنظم ساغر شاہیمی سیوہاروی)

کیا سوچتے ہو ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے
میں خونِ دو جہاں کا ہوں سر پر لئے ہوئے

ممتاز بارگاہِ محبّت میں ہے وہ دِل
پہلو میں ہو جو گرمیٔ محشر، لئے ہوئے

ابتک نہیں جیا کوئی جن کا قتیلِ، ناز
وہ بھی ہیں اپنے ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے

اُف کون کہہ گیا یہ کن آنکھوں سے دیکھکر
بیٹھے رہو ابھی دلِ مُضطر لئے ہوئے

اللہ رے اضطراب کی ہنگامہ سازیاں
میں دونوں پہلوؤں میں ہوں محشر لئے ہوئے

رگ رگ میں دل کی دوڑ رہا ہے وہی لہو
جس کا ہر ایک قطرہ ہے نشتر لئے ہوئے

دل میں ہمارے آئینہ رویوں کی یاد ہے
یہ آئینہ ہے بزم سکندر لئے ہوئے

ان کے حریمِ ناز کی جانب بڑھا ہوں میں
ہر گوشۂ نگاہ میں محشر لئے ہوئے

پھر ایک بار اور اُلٹ دیجئے نقاب،
بیٹھا ہوں آرزوئے مکرر لئے ہوئے

آنے لگے ہیں خون کے قطرے سر مژہ
ہاتھوں پہ لاشۂ دلِ مُضطر لئے ہوئے

مقتل میں حُسن کی کوئی بیتاب سی نگاہ
پھرتی ہے مجکو ڈھونڈتی خنجر لئے ہوئے

اللہ جانے عشق کا مفہوم جو بھی ہو
اک چوٹ سی ضرور ہوں دل پر لئے ہوئے

بس اک انہی پہ کرتی ہے دُنیا گمانِ قتل
بس اک وہی ہیں ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے

ہے میرے سوزِ دل کا پڑھایا ہوا سبق
وہ نالہ جو ہے گرمیٔ محشر لئے ہوئے

فصلِ بہار آتے ہی نیت بدل گئی
ساغر ہے اب تو شیشہ و ساغر لئے ہوئے

(غیر مطبوعہ)

دامانِ آستیں

جو روسکتے تو آنسو پونچھنے والے بھی مل جاتے (یاس لکھنوی) شریکِ رنج و غم دامن سے پہلے آستیں ہوتی

جو ٹھیرا وقت کا پابند وہ جوشِ جنوں کیسا (نوح ناروی) بہار آنے سے پہلے ٹکڑے ٹکڑے آستیں ہوتی

بہار آنے سے پہلے ہو چکے تھے ہاتھ شل میرے (بزم اکبرآبادی) گریباں کیسے پھٹتا چاک کیونکر آستیں ہوتی

شبِ وعدہ ادھر دل میں تمنا چٹکیاں لیتی (بیخود دہلوی) ادھر مخمور آنکھوں پر حیا سے آستیں ہوتی

تماشا یوں جنونِ عشق کا ہوتا تو لطف آتا (احسن مارہروی) ہمارا ہاتھ ہوتا مدعی کی آستیں ہوتی

گلے ہی کو نہ ہوتا ناز تنہا تیرے خنجر پر (خلیل بدایونی) ہمارے خون کی بھی چھینٹ فخرِ آستیں ہوتی

ہماری بیخودی ہے پردہ دارِ ننگِ عریانی (ساحر دہلوی) جنونِ پردہ در کو فکرِ جیب و آستیں ہوتی

مرادستِ جنوں ہی وجہ ایجادِ گریباں تھا (مجذوب میرٹھی) نہ ہوتی چشمِ تر میری تو پھر کیوں آستیں ہوتی

ہمارے گریۂ خونیں کا دھبہ اس پہ کیوں آتا (نجم اکبرآبادی) تیرے دامن کا سرصدقہ ہماری آستیں ہوتی

لہو کی بوند آنکھوں سے نکلتی جو محبت میں (حافظ پیلی بھیتی) بہارِ آستیں نقش و نگارِ آستیں ہوتی

یہ جو کچھ ہے خیالِ پردہ داری ہے عطا ورنہ (عطا بدایونی) گریباں اور دامن جیب چادر آستیں ہوتی؟

زمانہ قدرِ اشکِ بلبلِ نالاں اگر کرتا (باغ سنبھلی) بجائے برگِ گل اے باغ پیدا آستیں ہوتی

خلافِ وضعِ آزادی تھا عریانی میں پیراہن (شبیر مچھلی شہری) نہ کیوں دستِ جنوں کو عارِ قیدِ آستیں ہوتی

میری دیوانگی کا رکھ لیا پردہ نقاہت نے (آذر جالندھری) نہ دامن آجتک ہوتا نہ اب تک آستیں ہوتی

ترا دامن بچانا جب تو اک حد تک بجا ہوتا (انور بی۔ اے) اگر دستِ جنوں پر بار میری آستیں ہوتی

گریباں گیریٔ ضبطِ جنوں نے رکھ لیا پردہ (نہر انوری) نہ دامن آپ کا ہوتا نہ میری آستیں ہوتی

(از اختر آذری)